طلوعِ اسلام

دسمبر ۱۹۵۱

-/8/-

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی
اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگیں: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

۱) یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ

طلوعِ اسلام بدستور جاری رہیگا

(تفصیل کیلئے دیکھئے صفحہ ۴۲-۴۳)

---

۲) طلوعِ اسلام کے ناظم اب عارف بٹالوی صاحب کی بجائے خورشید عالم صاحب ہیں۔ جملہ خط وکتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ رالبن روڈ۔ کراچی

سے کی جائے۔

---

۳) جنوری ۱۹۵۲ء سے طلوعِ اسلام کی قیمت آٹھ آنے کی بجائے دس آنے فی پرچہ ہوگی۔ سالانہ چندہ بدستور سابق چھ روپے ہوگا۔ ضخامت بھی بدستور سابق بہتر ۷۲ صفحات رہے گی۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتب	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی) ساڑھے چودہ آنے (ہندوستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۴	دسمبر ۱۹۵۱ء	نمبر ۱۲

فہرستِ مضامین

لمعات ۲ - ۱۰
ایک ملحد اور دو خدا پرست ۱۱ - ۴۱
طلوعِ اسلام کا مستقبل ۴۲ - ۴۳
باب المراسلات ۴۴ - ۵۶
(پرویز صاحب)
۱۔ نظام صلوٰۃ اور نماز
۲۔ انسانی ارتقا
۳۔ آدم
نقد و نظر ۵۷ - ۶۳
۱۔ حیات اکبر الہ آبادی
۲۔ فتنۂ مودودیت
سازش اور بہت بڑی سازش ۶۴ - ۶۸
(علامہ تمنا عمادی صاحب)

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز —— ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت مجلد چار روپے۔ محصولڈاک نو آنے

معراجِ انسانیت (معارف القرآن۔ جلد چہارم)

سیرت صاحبِ قرآن —— قرآن کے آئینے میں

(قیمت بیس روپے) ۳۱ر دسمبر تک کے لئے رعایتی قیمت بارہ روپے محصولڈاک ۱عہ

تاریخِ رسالت (معارف القرآن۔ جلد سوم)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کے انبیائے کرامؑ کی دعوات انقلاب کا تذکرہ

(قیمت پندرہ روپے) ۳۱ر دسمبر تک کے لئے رعایتی قیمت دس روپے محصولڈاک ۱عہ

ادارۂ طلوعِ اسلام، رابسن روڈ، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اخبارات میں خبر چھپی کہ پاکستان اور مصر کے درمیان ثقافتی معاہدہ ہوگیا ہے۔ دوسری خبر شائع ہوئی کہ شام اور پاکستان میں تجارتی معاہدہ ہوگیا ہے۔ ان خبروں کی اشاعت پر خوشیاں منائی گئیں۔ پیغامات تبریک وتہنیت کا تبادلہ ہوا۔ سرکاری حلقوں میں اطمینان کا سانس لیا گیا کہ یہ ثقافتی اور تجارتی مواثیق، سیاسی اور عمرانی روابط کا پیش خیمہ ہیں۔ ان سے یہ مملکتیں ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔ ان ممالک کے رہنے والوں میں وحدت اور ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ ان کی حکومتیں ایک دوسرے کی بہی خواہ ہوجائیں گی۔ ان کے مفادمیں اشتراک پیدا ہوگا۔ اس سے باہمی اتحاد کے امکانات بڑھیں گے۔ یہ فال بڑی مبارک ہے۔ یہ شگون نہایت نیک ہے۔ یہ عنوانات بڑے خوش آئند ہیں۔ یہ انداز مستقبل کے متعلق بڑی خوشگوار توقعات کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ وقس علیٰ ھٰذا۔

یعنی ان ممالک کے باشندوں میں اِس سے پہلے، نہ کوئی وجہ روابط تھی نہ قدرِ مشترک۔ نہ باہمی اتحاد کا کوئی ذریعہ تھا نہ وحدت ویگانگت کا کوئی وسیلہ۔ نہ ان میں ہم آہنگیٔ فکر ونظر تھی نہ ایک دوسرے کے مفاد سے ہمدردی اور بہی خواہی۔ نہ ان میں سیاسی وعمرانی تعلقات کے لئے کوئی بنیاد واساس تھی نہ ایک دوسرے سے قریب ہونے کے لئے کوئی جاذبیت۔ نہ ان میں کوئی باہمی رشتہ تھا نہ علاقہ۔ اس لئے مقام صد ہزار شکر ہے کہ ان میں ثقافتی اور تجارتی معاہدہ ہوگیا جس سے باہمی روابط کے امکانات پیدا ہوگئے۔

یہ کن مُلکوں کے متعلق گفتگو ہورہی ہے؟ مصر، شام، عراق، حجاز، یمن، ایران، ترکی، مراکش، انڈونیشیا اور پاکستان کے متعلق! آپ کو معلوم ہے کہ ان ممالک کے رہنے والے کون ہیں؟ ان سب کے باشندے وہ ہیں جن کا خدا ایک ہے۔ رسولؐ ایک ہے۔ ضابطۂ قانون (قرآن) ایک ہے۔ قبلہ ایک ہے۔ نصب العین حیات ایک ہے۔ مقصدِ زندگی ایک ہے۔ اساسِ فکر ایک ہے۔ بنیادِ عمل ایک ہے۔ جو ایک کے نزدیک حرام ہے وہی دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔ جو ایک کے ہاں حلال ہے وہی دوسرے کے ہاں جائز ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جنھیں بنیان مرصوص سے تشبیہ دی گئی تھی یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند جن کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔ مخالفین کے مقابل نہایت سخت اور باہمدگر محبت ومودت کے پیکر۔ یہ وہ ہیں جنھیں ایک "جسدِ واحد" بتایا گیا تھا کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے

آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ جن کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک (کسے باشد) کسی دوسرے کے قتلِ عمد کا مرتکب ہوگا تو وہ سیدھا جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ یہیں تک نہیں بلکہ جن کی تعریف (Definition) یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی جان، مال، آبرو، راحت و آرام کا محافظ اور کفیل ہے۔ دو لفظوں میں یوں کہئے کہ یہ وہ ممالک ہیں جن کے باشندوں کے متعلق، خود خدا نے کہہ دیا تھا کہ

یہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔
(انما المؤمنون اخوۃ)[1]

یقینی طور پر بھائی۔ بلاشک و شبہ بھائی۔ ان میں اخوت (بھائی ہونے کے سوا) کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ (یہ سب کچھ لفظ انما کے اندر مضمر ہے)۔ یہ وہ رشتہ تھا جس کا اعلان خود خدا نے فرما دیا اور جس کے ایک ایک حرف پر ان سب کا ایمان ہے۔

یہ ہیں وہ ممالک جن کے متعلق آج سمجھا جاتا ہے کہ شکر ہے کہ ان میں باہمی تجارتی معاہدہ اور ثقافتی عہد نامہ ہو گیا جس سے ان میں کوئی تعلق تو پیدا ہوا ورنہ، ان معاہدات کے نہ ہونے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ان ممالک کے باشندے ایک دوسرے سے دور رہتے بلکہ اس کا بھی امکان تھا کہ ان میں باہمی مخاصمت ہوتی اور تعلقات ناخوش گوار رہتے!

سوچئے کہ ہم کہاں تھے اور اب کہاں پہنچ چکے ہیں؟ ہم وہ تھے جنھیں خود خدا نے ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تھا۔ اور اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ایک دوسرے سے روابط پیدا کرنے کے لئے ثقافتی اور تجارتی معاہدات کے محتاج ہیں۔ ہم وہ تھے جنھیں قرآن نے بنیان مرصوص (ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار) اور اشداء علی الکفار (مخالفین کے مقابلے میں سخت چٹان) قرار دیا تھا۔ اور آج ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم میں کچھ وہ ہیں جو مغرب کی مستبد حکومتوں کے شکنجۂ جور و ستم سے تنگ آکر استعمارِ فرنگیت کے خلاف محاذ قائم کرنے کی اپیلیں کر رہے ہیں اور دوسرے وہ جو ان آقایانِ مغرب کی پیشانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان اپیلوں سے ان پر بل تو نہیں پڑ رہے! ہم وہ تھے جنھیں قرآن نے ایک امت قرار دیا تھا۔ اور اب ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے ارباب فکر جمال الدین افغانیؒ کے وقت سے لیکر آج تک، اس تگ و تاز میں مصروف ہیں کہ کسی طرح مختلف اسلامی ممالک میں باہمی اتحاد کے سیاسی معاہدات ہو جائیں۔ لیکن ان کی یہ سعی و کاوش اس وقت تک کوئی اطمینان بخش نتیجہ پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی یہ تمام تپش و خلش فقط اتنا کر سکی ہے کہ ہم میں سے ایک کی مصیبت پر دوسرے ممالک کے مسلمان، ہمدردی کے ریزولیوشن پاس کر دیتے ہیں اور اپنی پوری "اخلاقی تائید" (Moral support) کا پختہ یقین دلا دیتے ہیں۔ جس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "چڑھ جا بیٹا سولی۔ رام بھلی کرے گا"۔

اور ستم ظریفی یہ کہ ہم میں سے ہر ایک، صبح کے وقت اٹھ کر، نہایت احترام و تقدس سے، انما المومنون اخوۃ، اور بنیان مرصوص اور اشداء علی الکفار رحماء بینھم، کی تلاوت کرتا ہے اور پھر دعا مانگتا ہے کہ فانصرنا علی القوم الکافرین۔

---

[1] اخوۃ کا مفہوم "بھائی" سے کہیں گہرا ہے۔ اس کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے۔

اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے یہ کہہ کر مصلی سے اٹھ بیٹھتا ہے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

آپ نے کبھی سوچا بھی کہ یہ ہوا کیا؟ آپ کسی سے پوچھئے۔ عام طور پر آپ کو جواب ملے گا کہ مسلمانوں میں باہمی اخوت و مودت اسلئے نہیں کہ ان کا قرآن پر عمل نہیں رہا۔ بہت اچھا! لیکن آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی کروروں مسلمان (ساری دنیا میں) ایسے ہیں جو نہایت شدت سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ حج اور زکوٰۃ میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ مذہب کے حرام و حلال میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ اپنی زندگی بڑی پرہیزگاری کی گذارتے ہیں۔ ان کے متعلق تو نہیں کہا جائیگا کہ ان کا عمل اسلام کے مطابق نہیں؟ لیکن ان کے نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور تقشف و تورع کی زندگی بھی تو مسلمانانِ عالم کے باہمی اتحاد و مواخات کیلئے کوئی سازگار فضا نہیں پیدا کر رہی؟ اسلئے مسلمان ممالک میں فقدانِ اتحاد و یگانگت کی اصل وجہ کچھ اور ہے۔ آیئے دیکھیں کہ یہ وجہ کیا ہے؟

قرآن، ایک آئینی نظام لیکر آیا تھا جس کی بنیاد ایک مخصوص تصورِ حیات (Ideology) پر تھی۔ اس آئیڈیالوجی کو قرآنی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ اس نے افرادِ انسانیہ کا حقیقی رشتہ اس آئیڈیالوجی کی وحدت کو قرار دیا۔ یعنی دنیا کے کسی حصے میں، کوئی انسان، کسی قوم، نسل اور وطن سے متعلق ہو۔ اس کی زبان بھی کچھ ہو۔ اگر اس نے اس آئیڈیالوجی کو اپنا نصب العین زندگی قرار دے لیا ہو تو وہ اس نظام کا ایک جزو بن گیا جو اس آئیڈیالوجی کی بنا پر قائم کیا گیا تھا۔ اس نظام کا مرکز ایک تھا اور دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے افراد، اس آئیڈیالوجی کی وحدت و اشتراک کی وجہ جامعیت سے ایک امت بن گئے تھے۔ یہ امت، امتِ واحدہ تھی۔ یعنی اس میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم نہیں تھی۔ اس امت کے افراد کا "معاہدہ" مرکزِ نظام کے ساتھ تھا اور یہی مشترکہ معاہدہ ان سب کو ایک رشتہ میں منسلک کئے ہوئے تھا۔ امت کے افراد کو آپس میں اتحاد و اتفاق کے لئے کسی معاہدہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ باقی رہیں وہ اقوام جو اس نظام سے باہر تھیں ان کے ساتھ اگرچہ حلیفانہ تعلقات تھے تو پوری کی پوری امت کے تھے اور اگر حلیفانہ روابط تھے تو بھی ساری کی ساری امت کے تھے۔ قرآن نے ان افرادِ امت کے متعلق جب "اخوۃ"، "بنیان مرصوص" یا "رحماء بینھم" کہا ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ اس نے انھیں ایسا بننے کا حکم دیا ہے (اُس نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہوئے اس قسم کے احکام کی ضرورت ہی نہ تھی) قرآن نے ان امور کے تذکرے سے صرف یہ بتایا ہے کہ یہ چیزیں اس نظام کی فطری خصوصیات (یا لازمی نتائج) تھے۔

قرآن نے، اس نظام کے ساتھ وابستہ افراد کے باہمی تعلق کیلئے اخوت کا لفظ استعمال کیا ہے (انما المومنون اخوۃ)۔ اس سے اس نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخ کے عام معنی تو بھائی کے ہیں لیکن استقاق (Root) کی رُو سے اس کے معنی زیادہ گہرے ہیں۔ اس کا مادہ "اَخِیَّۃٌ" ہے۔ اخیۃ اس رسّی یا کھونٹے کو کہتے ہیں جس سے گھوڑے یا اونٹ ایک تھان پر اکٹھے باندھے جائیں۔ لہٰذا آخ کے معنی ہیں وہ افراد جو ایک رسّی یا ایک کھونٹے سے باندھے جائیں۔ بعض کی تحقیق کے مطابق اس لفظ کا مادہ وخی ہے جس کے معنی قصد یا ارادے کے ہیں۔ اس اعتبار سے آخ کے معنی ہوئے ہم ارادہ یا ایک ہی قصد رکھنے والے افراد ہم مقصد، ہم منزل، ہم ارادہ۔ لہٰذا انما المومنون اخوۃ کے معنی ہوئے، وہ افراد جو آئیڈیالوجی کی وحدت (ایمان) کی رسی کے ساتھ

اکٹھے بندھے ہوں اور جن سب کا نصب العین اور منزلِ مقصود ایک ہو۔ دو بھائی، محض باپ کے رشتہ کی بنا پر بھائی ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد بھی ایک ہو لیکن آخ صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کی منزلِ مقصود ایک ہو۔ اس لئے تمام دنیا میں بسنے والے مومن، باہمد گر اخوت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، یہ قرآن کا حکم نہیں کہ مومنین کو باہمد گر اخ بنکر رہنا چاہئے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ مومن کہتے ہی انھیں ہیں جو منزلِ مقصود کی وحدت کی بنا پر ایک امت کے فرد اور ایک نظام کے اجزا ہوں۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ صیام۔ حج۔ سب اسی نظام کے عوامل و عناصر تھے جن سے یہ رشتۂ اخوت استوار رہتا تھا۔

یہ تھا وہ تصور جو دین نے عطا کیا تھا۔ آپ سوچئے کہ کیا اس تصور کے پیش نظر اس امر کا کبھی خیال تک بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمانوں میں ثقافتی، تجارتی اور سیاسی معاہدات کی ضرورت ہے؟

لیکن جب عجمی سازش اسلام کو ایک تحریک یا نظامِ زندگی (دین) کے مقام سے ہٹا کر مذہب کی سطح پر لے آئی تو ایمان کی جگہ عقائد نے لے لی۔ عقائد کے معنی ہیں وہ نظریات (Theories) جن کا عملی زندگی سے کچھ واسطہ نہ ہو۔ اس کے بعد دین (نظامِ زندگی) کے وہ عوامل (صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ) سامنے آئے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ سو مذہب نے انھیں ایک جیتے جاگتے زندگی بخش نظام کے عوامل ہونے کے بجائے خدا کی پرستش قرار دیدیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ پرستش کا انسان کی عملی زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اب دیکھئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ایک آئیڈیالوجی کو ماننے والے دو افراد جو ایک نظام سے وابستہ ہوں، قطبین کے فاصلے کے باوجود، وحدتِ فکر و عمل رکھتے ہیں اور انھیں باہمی دوستی کیلئے کسی اور عہد و پیمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر ایک ہزار افراد ایک مقام پر اکٹھے ہو کر خدا کی پرستش کریں تو پرستش کے بعد عملی زندگی میں ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے الگ راستے پر چل نکلے گا اور ان میں کوئی چیز بطور قدرِ مشترک باقی نہیں رہے گی۔ یہ اسلئے کہ مذہب ایک انفرادی شے ہے جسے انسان کی عمرانی اور سیاسی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم مذہب افراد کو بھی، سیاسی اور عمرانی زندگی میں اتحاد و اتفاق کیلئے سیاسی اور تجارتی معاہدات کی ضرورت پڑتی ہے۔ یورپ میں دیکھئے مختلف ملکوں کے باشندوں کا مذہب (عیسائیت) ایک ہے۔ پرستش کے وقت، مختلف ممالک کے لوگ ایک ہی گرجے میں جمع ہو سکتے ہیں۔ لیکن سیاسی اتحاد کیلئے انھیں سیاسی معاہدات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم مذہب ہونے اور آئیڈیالوجی کی بنا پر وحدت قائم ہو جانے میں فرق کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگ سکتا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ "وحدت" ہم مذہب ہونے کی رو سے ہے لیکن کمیونسٹوں کی وحدت آئیڈیالوجی کی وجہ سے ہے۔ (ہمیں اسوقت اس سے بحث نہیں کہ وہ آئیڈیالوجی کس قسم کی ہے۔ مثال صرف اس بات کی دی جا رہی ہے کہ ان کی وحدت آئیڈیالوجی کی بنا پر ہے)۔ افریقہ کا کمیونسٹ اور امریکہ کا کمیونسٹ، جب "ماسکو" کا لفظ زبان سے نکالیں گے تو یہ لفظ ان دونوں میں وحدتِ فکر و نظر کا مظہر ہوگا۔ اس کے برعکس، دنیا کے مختلف ممالک کے مسلمان، دن میں کم از کم پانچ مرتبہ "منہ طرف قبلہ شریف" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان سب کا رخ بھی ایک خاص سمت کی طرف پھر جاتا ہے لیکن اس سے دلوں میں کسی قسم کی ہم آہنگی محسوس نہیں کرتے۔ جب اسلام کا آئیڈیالوجیکل نظام (دین) قائم تھا تو اس وقت کعبہ (یا قبلہ) کے لفظ سے ان کے دلوں میں وہی اثر مرتب ہوتا تھا جو آج کمیونسٹوں کے نزدیک "ماسکو" کہنے سے ہوتا ہے (بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ عمیق اور

حرارت انگیز، اسوقت "قبلے کی طرف منہ کرنے" سے مقصود ایک مخصوص نظامِ حیات سے وابستگی کا اعلان تھا لیکن آج اس سے مراد پرستش کی ایک رسم ہے یعنی قبلے کی طرف منہ کرنے سے نماز ہو جاتی ہے اور اگر اُدھر منہ نہ کیا جائے تو نماز نہیں ہوتی۔ اسوقت دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے افراد جو اپنا منہ قبلے کی طرف کرتے تھے، باہمی اخوت کیلئے کسی سیاسی معاہدے کے محتاج نہیں تھے لیکن آج اسی قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والے باہمی روابط کیلئے "ثقافتی، تجارتی اور سیاسی معاہدات" کیلئے دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ —— ظاہر ہے کہ اس دوڑ دھوپ کے محرکات بھی سیاسی ہیں اور اس اتحاد سے مقصود بھی ہے محض سیاسی مفاد کا تحفظ۔ یعنی جذبۂ محرکہ (یا مقصدِ پیشِ نظر) یہ نہیں کہ دنیا کے مسلمان پھر سے اس نظام کو قائم کریں جو ان کے دین کا تقاضا ہے، بلکہ یہ کہ چونکہ مغربی اقوام کی چیرہ دستیوں سے مختلف اسلامی ممالک کی سیاسی زندگی (اور اس سے وابستہ مفاد) خطرے میں پڑ رہی ہیں اسلئے ان ممالک کے مسلمان چاہتے ہیں کہ الگ الگ رہنے کے بجائے مغرب کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا جائے۔ مقصد تو یہی ہے لیکن اس کیلئے قرآنی آیات اور ارشاداتِ نبویؐ کو جن میں مسلمانوں کی باہمی اخوت اور مودت کا ذکر ہے بطور دلائل و موئیدات استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اتحاد ایک اچھی چیز ہے لیکن جو اتحاد آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر نہیں بلکہ محض سیاسی مفاد کے تحفظ کی خاطر ہوتا ہے اسکا انجام وہی ہوتا ہے جو گذشتہ جنگ کے بعد انگلستان اور روس کے اتحاد کا ہوا۔ لہذا جبتک مسلمان اپنے "مذہب" کو دین سے تبدیل نہیں کرتے اور دین (آئیڈیالوجی اور نظام کی وحدت) کی بنیاد پر رشتۂ اخوت قائم نہیں کرتے، انکی کوشش صحیح نتیجہ مرتب نہیں کر سکتی۔ دولِ یورپ نے سیاسی مفاد کے تحفظ کیلئے اتحاد کی غرض سے پہلے لیگ آف نیشنز بنائی اور اب انجمن اقوامِ متحدہ موجود ہے۔ ان انجمنوں نے جو نتائج پیدا کئے ہیں وہ دنیا کے سامنے ہیں۔ یہی اتحاد ہے جسکے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ تحسبہم جمیعاً وقلوبہم شتّٰی "تم انہیں اکٹھے بیٹھے دیکھ کر خیال کرو گے کہ وہ ایک جماعت بن چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے جسم ایک جگہ ہیں اور دل الگ الگ"۔ یہ سیاسی اتحاد کی شکل ہوتی ہے جس میں ہر گروہ اپنی مصلحت کوشیوں کی فکر میں دوسروں کو ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن نے اتحاد (بلکہ ائتلاف) کی جو شکل بتائی ہے وہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر ایک نظام کا قیام ہے۔

نظام سے مراد کوئی ذہنی نظام نہیں بلکہ عملی نظام ہے جسے نظامِ مملکت یا حکومت کہتے ہیں۔ اس نظام کا مرکز کعبہ ہے جسے قرآن نے قیاماً للناس (جس سے انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے) سے تعبیر کیا ہے۔ یہی اس نظام کی غایت ہے یعنی تمام نوعِ انسان کی ربوبیت۔ دنیا کا ہر وہ فرد جو اس آئیڈیالوجی (ایمان) کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دے اس مرکز سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ جب قرآن نے کہا تھا کہ وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہٗ (تم دنیا کے جس حصے میں بھی ہو اپنا رخ ہمیشہ اسی مرکز کی طرف رکھو) تو اس سے یہی مراد تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی یاد دہانی کیلئے اجتماعِ صلوٰۃ میں قبلے کی طرف منہ کیا جاتا تھا۔ آج مسلمان اپنی نمازوں میں تو قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں لیکن باہمی اتحاد کیلئے "مسلم بلاک" کی اسکیمیں سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ قبلے کی طرف منہ کرنے سے مراد ہی یہ تھی کہ یہ سب ایک ہی بلاک کی اینٹیں ہیں جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ

> ایک ہوں مسلم، حرم کی پاسبانی کے لئے

مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد "حرم کی پاسبانی" ہے، سیاسی معاہدات نہیں۔ واضح رہے کہ حرم، کعبہ، مکہ سے مراد سعودی حکومت کا دار السلطنت نہیں بلکہ دین کے نظام کا مرکز ہے۔ جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہونگے اور جو امتِ واحدہ کی حکومتِ واحدہ کا مرکزِ واحدہ ہوگا۔ لتکونوا شھداء علی الناس۔ تاکہ یہ مرکز تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرتا رہے۔ کہ کوئی قوم ظلم اور فساد پر تو نہیں اُتر آئی۔

یہ ہے "مسلم بلاک" کا قرآنی تصور۔ اس کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمان اپنے موجودہ مذہب کو (جو عجم کے انتقام کا تراشیدہ ہے) اس دین سے بدل دیں جو ان کے خدا نے انہیں دیا تھا اور جو آج قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ایک ملحد اور دو خدا پرست

[زیر نظر مضمون میں، قارئین طلوع اسلام کے سامنے ایک بڑی دلچسپ بحث آ رہی ہے۔ لکھنؤ سے ایک ہفت روزہ اخبار شائع ہوتا ہے، صدق۔ عبدالماجد صاحب دریابادی اس کے مدیر ہیں۔ مذہبی حلقہ میں کافی متعارف۔ وہ بی۔ اے ہیں۔ شروع میں فلسفۂ خام سے متاثر ہو کر الحاد کی طرف جھک گئے تھے۔ پھر جب مذہب کی طرف آئے تو افراط سے تفریط کی طرف چلے گئے۔ جذباتی لوگوں کا الحاد اور مذہب اسی قسم کا ہوا کرتا ہے۔ دونوں طرف تشدد۔ صدق کی ۷ رجولائی ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں "الحاد سے اسلام کی طرف" کے عنوان کے ماتحت حسب ذیل شذرہ شائع ہوا۔

عرصہ ہوا دکن کے ایک مرد مسلمان کی تحریر موصول ہوئی کہ ان کے جوان تعلیم یافتہ بھائی پر الحاد کا دورہ پڑا اور وہ دیکھتے دیکھتے اسلام کے حدود سے باہر ہو گئے۔ ملحد نے اپنے خیالات، ۲۶ صفحہ کے ایک طویل ٹائپ شدہ مضمون میں ظاہر کئے ہیں اور اس سے گویا اپنی ملحدانہ پوزیشن کو خوب دل کھول کر دکھایا ہے۔ ذیل میں وہ اصل تحریر بجنسہٖ درج کی جاتی ہے اور اس کے مقابل کالم میں اس کا جواب مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب سندیلوی (دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ) کی طرف سے درج کیا جاتا ہے۔ نیچے بطور تردید مزید و تکملہ کے، مدیر صدق کے حاشیے ہیں۔ یہ سارا مجموعہ ظاہر ہے کہ بہت طویل ہو گیا ہے اور صدق کے متعدد نمبر اس کی نذر کرنے پڑیں گے لیکن یہ تطویل بیان انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گی اور ہر خدا پرست کو اس سے کچھ نہ کچھ سامان اپنی تسکین قلب کا ہاتھ آ جائے گا۔

اس کے بعد، رجولائی سے شروع اکتوبر تک یہ مضمون سلسلہ وار، صدق میں شائع ہوا ہے۔ اس انداز سے کہ ایک کالم میں "بیانِ ملحد" شائع ہوتا تھا اور اس کے نیچے نمبروار، مدیر صدق کی طرف سے تردیدی نوٹ۔ اور مقابل کے کالم میں حکیم سندیلوی صاحب کا جواب۔ یہ سلسلہ واقعی بہت طول پکڑ گیا۔ لیکن بات چونکہ بہت اہم تھی اس لئے صدق نے اسے تین ماہ میں مکمل کر کے چھوڑا۔

آپ شاید حیران ہوں گے کہ طلوع اسلام نے اس ذکر کو اپنے ہاں کیوں چھیڑا؟ آپ دیکھیں گے کہ "ملحد" کا بیان کسی خاص فرد کا بیان نہیں بلکہ یہ ترجمانی کر رہا ہے ان تمام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی جو ہمارے سکولوں سے سائنس اور فلسفے کی تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں جن میں دینیات کی تعلیم ان مولوی صاحبان کے سپرد ہوتی ہے جو انھیں کنوئیں سے ڈول نکالنے کے مسائل والا اسلام سمجھاتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف سائنس اور فلسفے کی تعلیم ان پروفیسروں کے

سپرد ہوتی ہے جو خالصتاً استاذانِ مغرب کے نقال اور قرآنی حقائق سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے یہ نوجوان ایک طرف ان تمام شکوک و شبہات کو دل میں لیکر کالج سے باہر آتے ہیں جو فلسفۂ خام کے لازمی نتائج ہیں اور دوسری طرف مذہب کی طرف سے نفرت کے جذبات لیکر جنھیں مولوی صاحبان نے کوٹ کوٹ کر ان کے سینے میں بھر دیا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے نوجوانوں کی عام حالت ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جنھیں یہ جرأت ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکوک و شبہات کو علانیہ ظاہر کر دیتے ہیں اور الحاد اور بیدینی کے فتووں سے نہیں ڈرتے باقی ایسے جوان خیالات کے اظہار کی جرأت نہیں کرتے۔ ان کے یہ شکوک، تپ دق کے جراثیم کی طرح، اندر ہی اندر پرورش پاتے رہتے ہیں اور ان کے جوہر انسانیت کو (جس کی نمود و بالیدگی قلب کے اطمینان اور ذہن کی بصیرت سے ہو سکتی ہے) تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں یہی حیثیت ہے اس "ملحد" کی۔ یعنی وہ درحقیقت ترجمانی کر رہا ہے ہماری اس قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کی۔

دوسری طرف، اس ملحد کے مقابلے میں، دو مولوی صاحبان ہیں۔ یہ بھی دو افراد نہیں بلکہ درحقیقت ترجمان ہیں اس طبقہ کے، جو اپنے آپ کو "مفتیانِ دین مبین اور حاملین شرع متین" سمجھتے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اپنے شکوک لیکر ان مولوی صاحبان کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں سے انھیں جس قسم کا جواب ملتا ہے، وہ مدیر صدق کے حواشی اور حکیم سندیلوی صاحب کے تردیدی مقالہ میں موجود ہے۔

لہٰذا "بیان ملحد" اور "جواب مسلم" معہ حواشی مدیر صدق، درحقیقت ایک آئینہ ہے اس کشمکش کا جو آج ہماری قوم کے نوجوان طبقے اور اجارہ دارانِ مذہب کے درمیان جاری و ساری ہے۔ آپ "ملحد" کے شکوک و اعتراضات اور دونوں مولوی صاحبان کی تردید اور جواب کا بغور مطالعہ کیجئے اور پھر ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ کیا مولوی صاحبان کا جواب، "ملحد" کے شکوک و شبہات کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے؟ اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مولوی صاحبان کا جواب، "ملحد" کے شکوک کو رفع نہیں کر سکا تو پھر آپ کو سوچنا ہوگا کہ اس قوم کا کیا بنے گا جس کے نوجوانوں کو ہم نے خود (غلط تعلیم دلا کر ان شکوک و شبہات کا آتشکدہ بنا دیا اور اس آگ کو "بردًا و سلامًا" بنانے کا کام ان مولوی صاحبان کے سپرد کر دیا جن کا وجود خود اس آگ کو ہوا دینے کا ذمہ دار ہے؟

سوچئے کہ یہ معاملہ بڑا اہم ہے! یہ کسی ایک فرد کا معاملہ نہیں، ساری کی ساری قوم کا سوال ہے! قوم کا سوال نہیں، اسلام کے مستقبل کا سوال ہے!!

اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حالات تسلی بخش نہیں بلکہ یہ ہمیں تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہے، تو پھر ـــــ قوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا۔ "اللہ کے لئے ایک ایک، دو دو کر کے، اٹھ کھڑے ہو اور سوچو!" سوچو کہ ہمیں کرنا کیا چاہئے۔ تمہارے سوچنے کی دیر ہے۔ راستہ خود بخود ابھر کر تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اس لئے کہ یہ اس کا وعدہ ہے جس نے ہر بھولے بھٹکے کی راہ نمائی اپنے ذمے لے رکھی ہے کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

[لیجئے اب اس کشمکش کو دیکھئے۔ پہلے مسلسل "بیانِ ملحد" ہے اور اس کے نیچے مدیر صدق کے تردیدی حواشی۔ اس کے بعد حکیم سندیلوی صاحب کا جواب ہے۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔ طلوع اسلام]

بیانِ ملحد

آج سے نہیں، ہزاروں سال سے خدا ایک ایسا معمہ بنا ہوا ہے جس کا کوئی موزوں ومناسب حل نہ مل سکا۔ اس کی گتھیوں کو جتنا سلجھانے کی کوشش کی گئی وہ اتنا ہی پیچیدہ ہوتا گیا[1]۔ اہل مذہب وخدا پرست لوگوں نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا۔ اس کو قادر (All powerful) اور (Almighty) قرار دیا۔ تخلیق کائنات کو اسی کا ادنیٰ کرشمہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ قدیم ترین ہے اور آخر ترین ہوگا۔ سب کا خالق ہے، حاکم ہے، مالک ہے، وہی پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، مارتا ہے، جلاتا ہے، دنیا کا کوئی کام اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا، حتیٰ کہ درخت کا پتہ بھی گرنے سے پہلے اس کے حکم کا محتاج ہوتا ہے[2]۔ وہ کام کرنے والا ہے، عادل ترین ہے، منصف مزاج ہے، اپنے بندوں سے محبت وشفقت کرتا ہے، نافرمانوں پر قہر وعذاب نازل کرتا ہے فرمانبرداروں پر برکات بھیجتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مادہ پرستوں نے یا اس جماعت نے جو اس کے وجود کی قائل نہیں اس نے ان سب باتوں کو لغو ومہمل ٹھہرایا۔ آیئے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ دونوں میں کون سچا ہے۔

سب سے پہلے اس بات کو لیجئے کہ ذہن انسانی میں خدا کا تصور کیونکر قائم ہوا[3]۔ علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہر اس بارے

---

[1] بسم اللہ ہی غلط۔ سارا دعویٰ بالکل بلا دلیل۔ بلکہ خلاف واقعہ۔ اگر محض شائبہ اختلاف کی بنا پر کسی شے کو "معمہ" کہا جاسکتا ہے، تو پھر دنیا کی چھوٹی بڑی ایک ایک چیز، کیا نظری اور کیا عملی، کیا علمی اور کیا اخلاقی، کیا فنی اور کیا ادبی "معمہ" ہی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کا اقرار دنیا کا جتنا زیادہ متفقہ اور غیر اختلافی مسئلہ ہے۔ اس کی نظیر بجز ریاضی ومنطق کے چند بدیہیات کے، دنیا کے سارے ذخیرہ مسائل میں کہیں سے ہی گی نہیں — اور ایسے ۹۹۹ء ۹۹ فی صدی متفق علیہ کو "معمہ" قرار دینا لفظ معمہ پر ظلم کرنا ہے۔ دنیا کی جتنی بھی مذہبی آبادی ہے، یعنی سارے ہندو، سارے مسلمان، سارے عیسائی، سارے یہودی، سارے مجوسی، مع اپنے چھوٹے بڑے سارے فرقوں کے بہر حال اتنے جزو پر تو سب متفق ہیں اور ہزار ہا سال سے متفق چلے آرہے ہیں کہ خدا ہے، اختلافات جو کچھ ہیں وہ صفات باری کی تعیین میں ہیں، نہ کہ نفس وجود باری میں۔ اور ان کروڑ ہا کروڑ اور اربوں کی تعداد کے مقابلہ میں منکرین کل کتنے ہیں؟ سَو میں ایک؟ جی نہیں ہزار میں ایک؟ اتنے بھی نہیں، لاکھ میں ایک؟ ہاں یہ تناسب ہو تو ہو! انگریزی انسائیکلوپیڈیاؤں میں انکار خدا کے متعلق یہ صراحت برابر ملتی ہے کہ (A relatively era intellectual Position.) یعنی ایک نادر الوجود عقیدہ۔ انبیاء، اولیاء کی تعداد کو چھوڑیئے۔ دنیا میں جو چوٹی کے حکیم، فلسفی، سائنٹسٹ، ادیب، شاعر، ڈاکٹر، انجینئر، غرض کسی علم وفن کے ماہرین گزرے ہیں، ان کا شمار جب چاہے کرکے دیکھ لیجئے کہ ان میں قائلین مذہب وخدا کتنے ہوئے ہیں اور منکرین وملحدین کتنے؟

[2] "حکم" بامرضی نہیں، جس میں مفہوم (Approval) کا شامل ہے، بلکہ صرف ارادہ، یامشیت یا قدرت یا (Will) کہئے جو ہرگز رضا کو مستلزم نہیں۔ یہ فرق بہت اہم ہے اور اس کو نظر انداز کردینا ایک بنیادی غلطی ہے۔

[3] اور اس سے بھی پہلے اس کو طے کر لیجئے کہ خود اس فیصلہ کا معیار اور مبنیٰ کیا ہوگا؟ محض ظن، تخمین، اٹکل، زبانی دعویٰ یا کوئی ٹھوس اور واقعاتی دلیل؟

مختلف الخیال ہیں۔[۵۱] اس سے تو آپ بھی واقف ہیں کہ زمانۂ قدیم میں جبکہ انسان ایک غیر مہذب و غیر متمدن زندگی بسر کیا کرتا تھا اس کی رہائش گاہ جنگل ہوا کرتے تھے وہاں اس کو نیچر کی بہت سی چیزوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ اکثر و بیشتر چیزیں اس کو عجیب معلوم ہوتیں اس سے طاقتور اور ڈراؤنی بھی۔ اس فطری جذبہ کے ماتحت اور اپنی کمزوری و جہل کی وجہ سے اس نے ان مظاہرات فطرت کو اپنے سے بالاتر تصور کیا۔ اپنے خوف و ہراس کو مٹانے کیلئے اپنی عقل کے موافق اس نے تدابیر اختیار کیں۔ دریا، پہاڑ، آگ، پانی، سورج، چاند یہ سب اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ ان کی اصلیت و ماہیت سے وہ واقف نہیں تھا اسی لئے ان چیزوں کے تعلق سے وہ اپنے آپ میں خوف و ہراسانی کے جذبات محسوس کرنے لگے گا۔[۵۲] اس جذبہ کو مٹانے کے لئے اس نے یاس و بے چارگی اپنی طرف سے ظاہر کی۔ اسی چیز کے اظہار نے رفتہ رفتہ پرستش کی صورت اختیار کی۔ چنانچہ سب سے پہلے دریا، پہاڑ، آگ، پانی، چاند، سورج وغیرہ کو خدا بننے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ آپ اب بھی بعض مذہب والوں کو دیکھیں گے جو دریا کو مقدس تصور کرتے ہیں۔ پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں کی پوجا ہوتی ہے۔ چندر بنسی اور سورج بنسی خاندان کے لوگ چاند اور سورج کو دیوتا تصور کرتے ہیں۔ ناگ سانپ کو لیجئے جو قدیم سے ہلاکت پھیلانے کیلئے مشہور ہے۔ اس کی اس ہلاکت خیزی کی وجہ سے اب تک بھی پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن قدیم زمانے کا انسان ان چیزوں کی خدائی سے مطمئن نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ طوفان برابر آتے رہے۔ سمندر میں تلاطم جاری رہے۔ آتش فشاں پہاڑ آگ برساتے رہے، دریا سیلاب لاتے رہے۔ ہر چیز پرستش کے باوجود جاری رہی اس چیز کو دیکھ کر نوع انسان نے ان چیزوں سے خوف کھانا کچھ کم کیا اور اس کا ذہن دوسری باتوں کی طرف منتقل ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ وہ کچھ مہذب و متمدن زندگی بسر کرنے لگا میرا مطلب سوشل زندگی سے ہے۔ جب قدیم انسان نے سوشل زندگی کی ابتدا کی تو گروپ یا جماعت کی باگ فطری طور پر ایسے شخص کے ہاتھ میں آتی رہی جو تجربہ کار اور زمانہ دیدہ ہوتا اس کو انھوں نے اپنا سردار تصور کیا۔ یہ سردار اپنی جماعت کی بہبودی و بھلائی کے سب کام کرتا، سب سے محبت کرتا اور اچھا سلوک کرتا۔ سب اس سے محبت کرتے۔ اس سردار کی فطری موت کے بعد انھیں مختلف شبہات پیدا ہوئے کہ آیا اب بھی اس کا تعلق ہمارے گروہ سے ہے کہ نہیں۔ آیا وہ اب بھی ہم پر نگرانی کرتا ہے کہ نہیں۔ اس سردار سے جماعت کے افراد کو جو تعلق خاطر ہوتا اس کی وجہ سے انھوں نے یہ فرض کیا کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔ گو مادی طور پر وہ ہم میں نہیں ہے لیکن اس کی روح ہمارے ساتھ ہے۔ یہیں سے روح کی بقا کا تصور پیدا ہوا۔ سوشل زندگی میں یہ بہت (sic) اہمیت رکھتا ہے جس نے بقائے روح کے تصور کو جنم دیا اور جس سے بعد کے لوگوں نے مختلف خیالات گھڑے ہیں۔ اس کو میں بعد میں لونگا۔ جب انھوں نے یہ تصور کیا کہ اس کی روح ہمارے ساتھ ہے تو حسب سابق اس کا احترام کرنا اس سے ڈرنا انھوں نے

---

[۵۱] خود ان دونوں علوم کا جیسے کہ وہ ہیں اہل تحقیق کے ہاں کیا درجہ اور سائنس کی میزان میں کیا وزن ہے؟

[۵۲] یہ سارے دعوے مسلسل بلا دلیل، محض مفروضات و مزعومات ہیں اور اکثر تو مشاہدے اور قرائن عقلی کے بالکل برعکس۔

انسان کی ضرورتیں جب تک سادہ رہیں اور اس کی صحیح و سادہ فطرت طرح طرح کے تکلفات اور مصنوعی اوہام و وساوس سے مسخ نہیں ہوئی وہ بالکل قدرتی اور وجدانی طور پر خالق و مخلوق کے صحیح تعلقات کی شناخت پر قانع و مطمئن رہا۔

جاری رکھا اور اسی چیز نے پرستش کی شکل اختیار کر لی۔ آنے والی نسلوں کو ان کے پیشرو بتاتے رہے کہ ہمارا ایک سردار تھا، وہ ایسا بہادر تھا، ایسا قوی تھا، وہ رحمدل تھا، محبت کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وہی تصورات نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتے رہے۔ اس کی بہادری و قوی ہیکل جسم کے مختلف تصورات پیدا کئے گئے جنھوں نے عجیب و غریب صورت اختیار کی۔ چنانچہ بعض اقوام کے دیوتا کی تصاویر سے آپ کو اس کی صحت کا اندازہ ہوگا کہ کس طرح ان کے دس پندرہ ہاتھ ہوتے ہیں، دو چار پیر ہوتے ہیں، ہاتھ میں ایک بڑا سا مگدر[5] ــــ وغیرہ

صرف حوادث طبعی سے ڈر کر احساس بے چارگی کے تحت یا زیادہ صاف الفاظ میں اپنی بزدلی و کمزوری کی وجہ سے انسان نے ایک بالاتر ہستی کو جنم دیا۔ اپنے معاشرتی و جغرافیائی حالات کے تحت اس نے اس کو مختلف سانچوں میں ڈھالا، مختلف رنگوں میں پیش کیا۔ اس کے خیالی تصور میں اس کا ذاتی ذوق کارفرما رہا مثلاً حبشیوں نے اپنے خدا کو اپنی ہی طرح کے موٹے ہونٹ، چپٹی ناک والا بنایا۔ اہل تھریس نے اس کو نیلی آنکھوں والا اور گوری رنگت والا بنایا۔ جوں جوں انسان نے ذہنی ترقی کے منازل طے کئے، ویسے ہی اس نے خدائی پیکر کو ترقی کے منازل طے کرائے۔ قدیم وحشی انسان کا خدا اس کی طرح وحشی اور غضبناک فطرت کا تھا۔ وہ ہر وقت غضبناک رہتا۔ اس کو قربانی بہت پسند تھی، قربانی سے وہ بہت خوش ہوتا تھا اسی لئے وحشی انسان نے نہ صرف جانوروں کی قربانی دی بلکہ ابنائے جنس کو بھی ان دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھایا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ خیالات میں جو شائستگی پیدا ہوئی ویسے ہی قدرت کے تصور میں بھی تبدیلی ہوئی۔ اب وہ اتنا غضبناک نہیں رہا۔ کچھ محبت کرنا اس نے سیکھا، کچھ رحمدلی و ہمدردی بھی اس میں پیدا ہوئی۔ بالآخر وہ زمانہ آیا جبکہ انسان نے ایک ایسے خدا کو جنم دیا جو سراپا محبت و ہمدرد تھا۔ رحمدل و معاف کرنے والا تھا۔ آپ اس خدا سے واقف ہیں یہ عیسائیت کا خدا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح خوف و ہراس و یاس و بیچارگی کے جذبات نے ایک خدا کے تصور کو جنم دیا۔ جغرافیائی حالات نے اس تصور کو مختلف سانچوں میں ڈھالا۔ یہ سانچے معاشرت و تہذیب کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے، یہ ایک بنیاد تھی۔ مذہب والوں نے اس بنیاد پر ایک عمارت کھڑی کی وسیع و عریض۔ انھوں نے اس کو لاتعداد صفات سے متصف کیا جو ــــ پہلے

سہ[5] (Animism) وغیرہ کے یہ نظریات تو انیسویں صدی میں رائج تھے۔ اب بیسویں صدی میں یہ ساری تھیوریاں فرسودہ ہو چکی ہیں اور اس صدی کے وسط میں برطانیہ، امریکہ وغیرہ کے بڑے بڑے فاضلوں اور اثریات (آرکیالوجی) اور مذہبیات متقابلہ (Comparative Religions) کے ماہروں، ڈاکٹر لنگڈن (Langdon) ڈاکٹر وولی (Wolley) ڈاکٹر شمڈٹ (Schmidt) سر چارلس مارسٹن (Marston) وغیرہ کی تحقیقات کا خلاصہ تو یہ ہے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک و مظاہر پرستی نہیں، بلکہ توحید و خدا پرستی رہا ہے، اور شرک بہت بعد کی پیداوار ہے، جب صحیح مذہبیت میں انحطاط پیدا ہو چکا۔

رہا وحشی قوموں اور قبیلوں کا بے خدا اور لامذہب ہونا تو اس کے متعلق چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے تازہ ترین ایڈیشن کا بیان ہے کہ علم الانسان کی مزید تحقیقات سے عموماً یہ ثابت ہوا ہے کہ ایسے مفروضات بے بنیاد تھے! (The progress of ethnological Know ledge Haveusually shownthat these suppositions were groundless.)

بیان کر چکا ہوں۔[1]

آیئے واقعات اور حقیقتوں کی روشنی میں آپ بھی یہ دیکھئے کہ واقعی مذہب کے بنائے ہوئے عقیدے کے مطابق کیا کوئی خدا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کا تصور مسلّمہ حقائق پر مبنی ہے، کیا وہ واقعی کائنات کا خالق ہے کیا وہ درحقیقت ان صفات سے متصف ہے جو بیان کئے جاتے ہیں۔[2]

اگر خدا واقعی بنی نوع انسان کا پیدا کرنے والا ہے تو کوڑھی، اپاہج، لنگڑے، لولے، اندھے، بہرے، فاتر العقل اور دیوانے اس نے کیوں پیدا کئے، مجرمانہ ذہنیتیں کیوں دیں؟ کیا ایسی قوت جو ہر نوع مکمل ہو جو (Almighty) اور (All powerful) ہو تخلیق کی بہترین قوت کی حامل ہو، اس سے ایسی ناقص مثالیں تخلیق کی مل سکتی ہیں؟ تخلیق کی ناقص مثالوں کی آپ وجہ بتائیں گے کہ ماں باپ نے عیاشی کی، مختلف جنسی بیماریوں میں مبتلا ہوئے اس کا نتیجہ ایسی اولاد ہے تو منصف خدا کا کہاں کا یہ انصاف ہے کہ ماں باپ کی بے راہ روی کی سزا معصوم اولاد کو دی جائے؟ یا کوئی اور سائنٹفک وجہ ہو تو پھر خدا کا کہاں دخل رہا۔[3]

درحقیقت وہ نظام عالم کا سنبھالنے والا ہے تو طوفان، زلزلے، قحط و وبا، مصائب و آلام کا اس نے کیا فائدہ سوچا؟ خونخوار درندوں اور زہریلے کیڑوں کی تخلیق سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہا، شیر کو کیا اسی لئے قوی پنجہ دیا کہ وہ ہرنوں پر جھپٹتا پھرے اور عقاب کو اسی لئے قوی بازو دیئے کہ وہ چڑیوں کو ان میں جکڑ لے۔

لاکھوں بندگانِ خدا ایسے ہیں جو دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں بھی اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہیں، سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہاتے ہیں، ہر قسم کے مصائب برداشت کرتے ہیں، صرف اس امید پر کہ ایک دن ان کی کھیتیاں لہلہائیں گی اور انھیں اپنی محنت کا ثمرہ ملے گا۔ ان کی آنکھیں آسمان کو دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتی ہیں، لیکن ایک قطرۂ آب بھی بصورتِ رحمت نہیں برستا۔ عین ایسے وقت میں اطلاع ملتی ہے کہ فلاں مقام پر رحمتِ ایزدی اتنی برسی کہ جل تھل ایک ہوئے۔ سیلاب آئے، طوفان آئے، دریا میں (Flood) آئے اور اطراف و اکناف کا اتنا حصہ تہ آب ہو گیا۔ اگر آپ کا خدا واقعی نظامِ عالم کے چلانے کا ذمہ دار ہے تو وہ ایسے ڈھنگے طریقے کیوں اختیار کرتا ہے کہ ایک جگہ تو لوگ پانی کے قطرہ قطرہ کو ترستے ہیں اور دوسری جگہ قطرہ قطرہ زحمت

---

[1] یہ ساری عبارت آرائی محض لاطائل رہی۔ یہ ساری باتیں تو انحطاطِ مذہب سے پیدا ہوئیں نہ کہ ارتقاءِ مذہب سے۔ یعنی مذہب جب بگڑا تو اس کا سارا بگاڑ ان ان صورتوں سے ظاہر ہوا نہ یہ کہ مذہب پیدا ان راستوں سے ہوا۔

[2] کیا وہ واقعات و حقائق ایسے ہی ہوں گے جیسے اب تک آپ پیش کرتے آئے ہیں؟ ـــــ شیخ چلی کی حکایتوں اور الف لیلہ کے افسانوں کا نام علمی حقائق و دلائل!

[3] اصل مسئلہ کا جواب تو ابھی آتا ہے۔ اس فقرہ کو پڑھ کر سوال بے اختیار یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ کی عقل سلیم میں کسی واقعہ کا کوئی سائنٹفک سبب موجود ہونا اس امر کے منافی ہے کہ اس واقعہ کی تہ میں خدائی ہاتھ ہے؟ گویا کسی واقعہ کے قریبی، سطحی، فوری سبب اور اس واقعہ کے حقیقی، بعید اور آخری سبب کے درمیان نسبتِ تضاد ہے؟ ـــــ اگر ایسا ہے تو خود اس سطحیت اور کم بینی کا کیا علاج؟

بن جاتا ہے۔ اگر اسے ہم جیسے نافرمانوں پر عذاب نازل کرنا تھا تو اس نے اپنے فرمانبرداروں کو کیوں فراموش کر دیا اور ہمارے ساتھ پیس دیا۔ کیا رحمدل خدا کو یہ پسند ہے کہ لاکھوں انسان بھوک کی تکلیف سے ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر جائیں اور ہزاروں بچے اپنی ماں کی چھاتیوں سے لپٹ کر بلکتے و تڑپتے رہیں؟

اس کائنات کا ناظم اعلیٰ زلزلے بھی پیدا کرتا ہے جس سے آن کی آن میں سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لطف و عنایت کرنے والا خدا آتش فشاں پہاڑوں کو حکم دیتا ہے آگ برسانے کا اور آن کی آن میں بستیاں جل کر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ مہربان خدا کی مہربانی ہی سے دریا میں سیلاب آتے ہیں اور بستیاں بہا لے جاتے ہیں۔

جب درخت کا پتہ بھی گرنے سے پہلے اس کے حکم کا محتاج ہے تو کیا چنگیز اور ہلاکو کی تخلیق کی ذمہ داری اس کی گردن پر نہیں ڈالی جا سکتی جن کی خون آشام تلواریں معصوموں کے گلوں پر چلتی رہیں؟ کیا انسانی کھوپڑیوں سے قائم کیا ہوا مینار اس کے حکم کے بغیر کھڑا رہا؟ کیا ظالم حکمران اس کے حکم کے بغیر حکومت کرتے رہے؟

تاریخ گواہ ہے کہ اس دنیا میں باطل نے حق پر فتح پائی ہے، جھوٹ نے سچ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ظالم و سفاک مظلوموں سے زیادہ خوش رہے ہیں۔ تنگ و تاریک قید خانوں میں بے گناہوں کو جکڑا گیا ہے۔ معصوموں نے پھانسی پائی ہے۔ بے گناہوں کے خون سے سولیاں رنگی گئی ہیں۔ انسانی فلاح چاہنے والوں کے جسم شکنجوں میں جکڑے گئے ہیں کیا یہ سب عادل اور منصف خدا کے علم کے بغیر ہوتا رہا؟ اگر واقعی وہ عادل ہے تو کیوں اس نے ایسے موقعوں پر غفلت برتی، کیوں بیدار نہیں ہوا؟

اگر واقعی وہ دعاؤں کا سننے والا ہے تو بوڑھے ماں باپ کی دعاؤں کو کیوں ٹھکراتا رہا؟ ان کے بڑھاپے کے سہارے اس نے کیوں چھینے؟ جوان بیویوں کے سہاگ کو کیوں برباد کیا؟ معصوم بچوں پر یتیمی و بیسیری کی بلا کیوں نازل کی۔ [1]

---

[1] جو سوال صرف ایک چھوٹی سی سطر میں یوں پیش کیا جا سکتا تھا کہ "دنیا میں آخر شر کا وجود کیوں ہے؟" اس کے لئے بالکل بلا ضرورت صفحوں کے صفحے سیاہ کرتے چلے جانا خدا معلوم کس آئین عقل کے موافق ہے!

لیکن اگر شر کی تکوینی مصلحتوں کا ضابطہ بندوں کی سمجھ میں نہ آ سکے تو کیا اس سے خالق کائنات ہی کے وجود سے انکار لازم آ جائے گا! ——— شر اور خیر تو روشنی و تاریکی کی طرح اضافی اور ایک دوسرے کے مقابل الفاظ ہیں۔ اگر تاریکی نہیں تو روشنی بھی نہیں۔ اگر شر نہ ہو تو خیر بھی بے معنی رہ جاتا ہے۔

عالم کو جب عالم ابتلا ایک بار مان لیا گیا تو اب سوا اس کے اور صورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے کہ شرافت کے، شجاعت کے، سخاوت کے، دیانت کے، عفت کے، صداقت کے، عدل کے، صبر کے امتحان ہر وقت ہوتے رہیں اور ان کے مواقع ہر لمحہ و ہر آن پیش آتے رہیں۔ اور خود یہ مواقع کیسے پیش آنے ممکن ہیں جب تک ٹھیک اسی قوت و شدت کے ساتھ ان کے مقابل رذالت کے، بزدلی کے، بخل کے، خیانت کے، بے عصمتی کے، حرص کے، جھوٹ کے، ظلم کے، مصیبت کے مواقع بھی سامنے نہ آتے رہیں؟ ——— "رحم دل انسان" کا ظہور ہی کیسے ہو سکتا ہے اگر دنیا میں کوئی مظلوم و مصیبت زدہ نہ ہوتا؟ کوئی انسان "سخی" کیسے ہو سکتا تھا جب تک کوئی دوسرا انسان حاجتمند و فلاکت زدہ نہ ہوتا؟ دلیر و شجاع آپ کسی کو کہہ ہی کیونکر سکتے جب تک خطروں کا سامنا نہ کرنا ہوتا؟ عصمت و پرہیزگاری کے معنی کیا تھے، اگر شہوانیت کے طوفان برپا ہوتے رہتے؟

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اگر تخلیق عالم اسی کا ادنیٰ کرشمہ ہے تو کیا وہ اپنے اس کرشمہ کو کسی اور ڈھنگ سے پیش نہیں کر سکتا تھا کیا انسانی آہ و کراہ کی دردناک چیخوں کے بغیر یہ عالم اس کو سونا نظر آتا؟ اپنی مخلوق پر آئے دن مصائب و عذاب نازل کر کے آخر وہ کیا دیکھنا چاہتا ہے؟ وہ کیوں ان کے صبر کو آزمانا چاہتا ہے؟ بے نیاز ہو کر بھی اس کو ہماری نیازمندی کی ضرورت ہے؟ تاثر و احساس سے بے گانہ ہو کر بھی وہ کیوں ہماری عبادت سے خوش ہوتا ہے؟ اس کو جب ہماری کسی چیز کی ضرورت نہیں تو پھر کیوں ہماری عبادت کے لئے اتنا (Particular) ہے؟ جب ہماری نافرمانی سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا تو پھر کیوں ہم پر عذاب نازل کرتا ہے؟ ایک رحیم و کریم خدا کے ہوتے ہوئے دنیا ہنگاموں کا مرکز کیوں بنی ہوئی ہے؟ جب ایک قادر مطلق خدا موجود ہے تو یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ اپنے ارادوں کا آپ مالک ہوتے ہوئے وہ اس قدر لاچار و مجبور کیوں ہے؟ جب مجبور نہیں تو پھر نیند سے کیوں بیدار نہیں ہوتا؟ [1]

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) شر کے وجود پر اعتراض، بجنسہٖ اور سو فی صدی اعتراض خیر کے وجود پر ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تاریکی کے وجود پر اعتراض روشنی کے وجود پر اعتراض ہے۔

اب یہ کہ قادر مطلق نے عالم کو سرے سے عالم ابتلا ہی کیوں بنایا، اور ہدایت و ضلالت دونوں ہی کو پیدا کیوں کیا، تو اس کا جواب ہی ظاہر ہے قادر مطلق ساتھ ہی حکیم مطلق بھی تو ہے۔ اور جس طرح اس کی قدرت غیر محدود ہے، اس کی حکمت بھی لاانتہا ہے، اور جس طرح عقل بشری اپنی محدود و ناقص قوتوں کے ساتھ اس کی قدرتوں کو گرفت میں نہیں لا سکتی، اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا بھی احاطہ نہیں کر سکتی۔ عقل بشری اگر ان کے احاطہ کے لئے کافی ہو جائے تو سرے سے ایک مافوق العقل قوت و حکمت کے ماننے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ علت و معلول کی انھیں الجھنوں سے تو عاجز آ کر ایک ایسی آخری ہستی کو تسلیم کیا گیا تھا جو علت ہی علت ہے اور خود کسی کی معلول نہیں۔ جس کی قدرت سب پر غالب ہے، اور وہ خود کسی سے مغلوب نہیں، جو موثر سب پر ہے اور خود کسی سے متاثر نہیں ــــ غرض عقل و منطق کی جو مجبوریاں ہمیں اس پر لائی تھیں کہ ایک خدا کا وجود تسلیم کریں اور ہی اس پر مجبور کر رہی ہیں کہ ایسے خدا کا وجود تسلیم کریں جو **فعال لما یرید** ہو۔ جس کا ارادہ سب پر غالب ہو، اور جس کے اعمال و افعال بشری توجیہات سے بلند تر ہوں۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [1] ان تمام سوالات کو کوئی دور کا بھی واسطہ نہ عقل سے ہے نہ علم سے، نہ منطق سے، نہ سائنس کے کسی شعبہ سے! ان کا تعلق اگر ہے تو صرف ادنیٰ درجہ کی خطابت و شاعری سے!

اصل اور کلی جواب جو اس قسم کے سارے سوالوں کا قیامت تک کیلئے ہے وہ ابھی اوپر گذر چکا ہے۔ یعنی کوئی نہ کوئی مصلحت تکوینی، زمان و مکان کے طویل سلسلہ موجودات کی تہ میں خدا معلوم کون کون سی حکمتیں۔

باقی اگر سوالات ہی کا شوق ہے تو اس قسم کے جوابی سوالات بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔ آخر انسان نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ اس کے ساتھ جو بھی معاملہ کیا جائیگا ہمیشہ اس کی محدود عقل و فہم کے مطابق ہوگا؟ وہ خالق کے رحم و کرم اور حسن انتظام کو ہمیشہ اپنی ہی خودی اور خود غرضی کے معیار سے جانچتا رہے گا؟ آخر کب تک وہ اس پر مصر رہیگا کہ عالم و مافی العالم میں جو کچھ بھی ہو اسے ایک مشت خاک ہی کے پیمانہ سے ناپا اور تولا جاتا رہے؟ اس نے یہ کہاں سے فرض کر لیا ہے کہ تخلیق و تکوین کائنات کے اگر کچھ دوسرے ضابطے اور قانون ہوتے تو ان پر بھی وہ اپنی بے چین طبیعت کے تقاضے سے اسی طرح نہ چیخا چلاتا رہتا؟ انسان نے اپنی "عقل" پر بھروسہ کر کے دنیا کے ہر خطہ اور علاقہ میں جو قانون معاشرت و اخلاق کے بنائے ہیں، آخر ان میں سے کسی پر اسے آج تک اطمینان نہ ہوا؟ دنیا کا ہزاروں سال کا تجربہ کیا کہہ رہا ہے؟ وقس علیٰ ہذا ــــ اور پھر اگر سارے اعمال خدائی کی حکمتیں بالفرض معلوم بھی ہو جائیں تو اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ ذہن انسانی اس منزل پر رک جائے گا اور خود ان حکمتوں کی حکمت کے درپے اسی طرح نہ ہو جائے گا؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی دنیا (Universe) کیسے پیدا ہوئی جبکہ اس کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ نظام عالم کیونکر قائم ہے جبکہ اس کا چلانے والا کوئی نہیں؟ کائنات کا وجود خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی خالق ہے جس کے بغیر مخلوق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ خود خالق کہاں سے آیا؟ جس طرح یہ کائنات خود بخود نہیں پیدا ہو سکتی اس کا خالق خود بخود کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جس طرح دنیا کا خود بخود پیدا ہونا مذہب والوں کے نزدیک قرین قیاس نہیں، تخلیقِ عالم کیونکر ہوئی یہ ایک ایسا پیچیدہ سوال ہے جس کا موزوں جواب نہ مذہب والے بتا سکے نہ مادہ پرست۔ پھر بھی مادہ پرستوں نے جو بتایا ہے وہ بڑی حد تک واقعات پر مبنی ہے مہمل عقائد پر نہیں جیسا کہ مذہب کے پیروؤں نے بتایا ہے۔ مادیین کا کہنا ہے یہ دنیا، مادہ (Matter) کا نتیجہ ہے[۱]۔ مادے کے مختلف عناصر مختلف حالات کے تحت مختلف تپش، دباؤ پر مختلف ترکیبوں میں مختلف تناسبوں میں حصہ لیتے ہیں جس کے باعث مختلف اشیا بنتی ہیں۔ اور یہ صحیح بھی ہے، کوئی عقیدہ نہیں۔ معمولی آلات سے تجربہ گاہوں میں ایک ہی نوعیت کی شئے سے مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ آکسیجن ہی کو لیجئے، دو سالمہ ہوں (O2) تو وہ آکسیجن ہے ایک سالمہ بڑھ جائے تو وہ اوزون (O3) ہو جاتی ہے۔ (H2O) ہے تو پانی آکسیجن کا ایک سالمہ مل جائے تو وہ (H2O2) یعنی ہائیڈروجن پر آکسائڈ جو پانی سے مختلف شے ہے۔ مادیین کا یہ کہنا کہ مختلف عناصر کا مختلف امتزاج مختلف اشیا کے وجود کا باعث ہے بالکل ٹھیک ہے۔ انسان کا وجود بھی ان ہی عناصر کا مناسب و موزوں امتزاج ہے۔ اس امتزاج میں کسی کے ارادے کا دخل رہا نہ حاجت رہی۔ روح یا حیات ان ہی اجزا کی امتزاجی کیفیت کا ایک نام ہے[۲]۔ امتزاج درہم برہم ہو جائے تو روح یا حیات ختم۔ یہی حال دنیا کی اور چیزوں کا ہے۔ مادیین کے اس کہنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اب ہر چیز کا تجزیہ ممکن ہے اور ہر چیز کو مصنوعی طریقے پر بنایا جا سکتا ہے[۳]۔ صرف وہ امتزاج جاننے میں آج کا انسان ناکام رہا ہے جس سے حیات وجود میں آتی ہے۔ مگر یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ اور توانائی آئے کہاں سے؟ مادیین نے اس سوال کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا کہ خود بخود پیدا ہوئے۔ جس طرح خدا کا خود بخود پیدا ہونا ایک عجیب بات ہے اسی طرح مادے اور توانائی کا خود بخود وجود میں آنا ایک عجیب بات ہے[۴]۔

---

[۱] اور خود یہ مادہ اور قوت کیا ہیں؟ اور کہاں سے آگئے ہیں؟ ــــ گویا وہی عقل جو خدائے کامل و واحد کا وجود تسلیم کرنے میں اپنے لئے تنگی محسوس کر رہی ہے، اسے ایک نہیں دو لایعقل و بیجان خود آفریدہ ہستیاں تسلیم کرنے میں ذرا بار نہیں محسوس ہوتا!

[۲] لیکن یہ "مادے کے مختلف عناصر" جو خود بخود بلا کسی فاعل ارادی کی مدد کے، مختلف تناسبوں میں حصہ لیتے رہے ہیں، اور انھیں سے "مختلف اشیاء بنتی رہتی ہیں"۔ گویا خود بھی فاعل مختار ہیں اور اس طرح محض مادہ و قوت ہی نہیں بلکہ سب کے سب "عناصر" بھی خدا ہی ہیں! ــــ دلیل کا خلاصہ تو صرف یہ نکل رہا ہے اور مضمون نگار اب منکر خدا نہ رہا بلکہ اثبات شرک کا مدعی ہو گیا۔

[۳] لیکن کسی شے کے سبب قریب و اضافی کا علم، اس کے سبب بعید و حقیقی اور مسبب الاسباب کی طرف سے کیسے بے نیاز کر دیتا ہے؟

[۴] ایک مشہور فلسفی کی زبان سے اس سوال کا جواب یہ منقول ہے کہ اس نظام عالم کو دیکھنے کے بعد خدا کو اگر مانا جائے تو عجیب ہے لیکن اگر نہ مانا جائے تو اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب ہے۔

مادہ ہو کہ خدا دونوں میں سے کسی کا بھی خود بخود پیدا ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے۔[۱] اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خود بخود کوئی چیز پیدا ہو سکتی ہے تو وہ خدا بھی ہو سکتا ہے اور مادہ بھی، ورنہ دونوں نہیں۔ [۲]

فرض کیجئے کہ خود بخود کوئی چیز پیدا ہو سکتی ہے تو آیئے دیکھیں وہ خدا ہو سکتا ہے یا کہ مادہ۔ مذہب نے خدا کو جس روپ میں پیش کیا ہے وہ تو سراسر مہمل اور لغو ہے۔ اہلِ مذہب کہتے ہیں کہ وہ خالقِ عالم ہے، قادرِ مطلق ہے، بنانے بگاڑنے کی بہترین قوت رکھتا ہے۔ ہر چیز کا اسے علم ہے ہر شے پر اس کی قدرت ہے۔ اپنے ارادے کا آپ مالک ہے جو چاہے وہ کرتا ہے وغیرہ لیکن اس سے آج تک کسی چیز کا اظہار نہیں ہوا۔ نظامِ عالم کے جاری رہنے کے جو مقررہ اصول ہیں اس سے ہٹ کر کوئی کام نہیں ہوا۔ کبھی سورج کی جگہ چاند نکلا نہ چاند کی جگہ سورج۔ صرف اسی خوش اعتقادی سے یہ کہنا کہ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے لیکن دکھانے کا عادی نہیں۔ کسی مختلف الخیال کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں۔[۳]

مظاہرِ فطرت کے راز جب تک سربستہ رہے خدا کا بول بالا رہا۔ ہر وہ مظہرِ فطرت جس کو اس وقت کی انسانی عقل حل نہ کر سکی وہ خدا کی قدرت میں داخل ہوئی، اس کی مرضی میں شامل ہوئی۔ اگر وہ انسان کے لئے خوش آئند تھی تو وہ خدا کی رحمت و برکت تصور کر لی گئی۔ اگر تباہ کن تھی تو اس کو خدائی عذاب و قہر کے نام دیئے گئے۔ علم کی ترقی نے جب سب راز معلوم کئے ہر چیز کی ماہیت معلوم کی اور تمام عقدے حل ہو گئے تو سب حیرانیاں دور ہو گئیں۔ کل تک جو بات خدا کی قدرت میں داخل تھی آج وہ ایک معمولی حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ علم کی اس ترقی نے مذہبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔[۴] مذہب کی بنیادیں جو جھوٹے مہمل اور لغو

---

[۱] وہ عقل بھی کچھ عجیب ہی سی ہے جو دونوں کی حیرت انگیزی کو یکساں سمجھتی اور ایک ہی سطح پر رکھتی ہے۔ ایک طرف نظامِ کائنات اپنی ساری کارگری صناعی، بوقلمونی کے باوجود محض ایک لایعقل، بیہوش، بے ارادہ، جامد مادہ کے تقلبات کا ثمرہ و نتیجہ۔ اور دوسری طرف ایک صاحب ارادہ، حکیم علی الاطلاق، فاعلِ مختار کی مشیت کی پیداوار!

[۲] گویا آپ کی عقلِ سلیم اتنے صریح اور واضح فرق کو نظر انداز کر جائے گی کہ مادہ تو انہیں مصنوعات کا ہم جنس ہے جو اشیائے عالم کہلاتی ہیں اور جن پر فنا طاری ہوتے ہوئے ہر وقت آپ دیکھتے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے خدا جس ہستی کا نام ہے وہ ساری مصنوعات کی ساری ممکنات سے ماوراء اور قانونِ زوال سے منزہ ہی ہے ـــ دونوں کو یکساں خود آفریدہ تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کو زمین و آسمان کا فرق نظر نہیں آتا؟

[۳] دلیل کا خلاصہ سیدھے سادے الفاظ میں یہ نکلا کہ خدائی حکومت ایک نظام، ایک ضابطہ، ایک قانون پر کیوں قائم ہے؟ اور معجزات و خوارق کا ظہور برابر کیوں ہوتا نہیں رہتا؟ ـــ گویا الحاد نے پہلی بار اب کی پینترا بدلا ہے ورنہ اب تک تو مذہب پر اعتراض یہی رہا ہے کہ قانونِ قدرت کے ہوتے ہوئے خرقِ عادت کیسا؟ اور اب پہلی بار فرمائش یہ ہو رہی ہے کہ یہ خدا کیسا جو قانونِ قدرت کے اندر گھرا اور جکڑا ہوا ہے اور خرقِ عادت کر کرکے دکھاتا نہیں!

[۴] سبحان اللہ! وہ کون سے "راز اور عقدے" کائنات کے ہیں جو اب تک حیرانیاں پیدا کئے ہوئے تھے۔ اور اب حل ہو گئے ہیں! یا بہت سے راز اور عقدے بہ صیغۂ جمع نہیں، ایک ہی راز و عقدہ بہ صیغۂ واحد ذرا ارشاد ہو جائے! ـــ ہر چیز کی ماہیت تو خیر چھوڑیئے۔ کسی ایک ہی چیز کی "ماہیت" خدا کیلئے ارشاد ہو جائے جس نے "خدا کی قدرت" کو "ایک معمولی حقیقت" میں تبدیل کر دیا ہے؟

(باقی حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

ناقابل فہم عقیدوں و اعتقادوں پر قائم تھی ہلنے لگیں[۵۱]۔ انسان نے ہر اس چیز پر قدرت حاصل کی جس پر صرف خدا کی قدرت تھی[۵۲]۔ کم علمی و نادانی کے باعث جن مظاہر فطرت نے انسانی ذہن کو خدا کے وہم میں مبتلا کیا تھا اسی کے علم نے خدا کے وجود کے لئے ایک اٹیم بم کا کام کیا۔ صرف خیال اور تصور سے انسانی دماغ مطمئن نہیں ہو سکتا جب اس نظام عالم کے چلنے کے مقررہ اصول ہیں اور ہر اصول ایک خاص وجہ سے ہے اور وجہ آپ کو معلوم ہے تو پھر اس میں خدا کا کیا دخل۔ صرف بارش ہی کو لیجئے۔ آپ کہتے ہیں خدا پانی برساتا ہے جغرافیہ اور ابتدائی سائنس آپ نے پڑھی ہے۔ بارش کیونکر ہوتی ہے آپ کو معلوم ہے پھر اس کے باوجود یہ کہنا کہ خدا پانی برساتا ہے کہیں بارش نہ ہو تو اس کی مرضی ہے، کہیں ہو تو اس کی رحمت ہے کتنی لغو اور مہمل بات ہے۔ ہر واقعہ کے حادثہ میں کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے آپ اس وجہ کو صاف طور پر نظر انداز کر دیں اور اس حادثہ میں خدا کی مرضی کو ٹھونسنے کی کوشش کریں تو کون اس کو قبول کریگا[۵۳]۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) میرے بھائی عقدے جتنے بھی حل ہوئے ہیں اور ترقیاں جتنی بھی ہوئی ہیں سب کی سب آپ کی سائنس ہی کے شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ حقائق مذہب یا خدا کی قدرت سے! اکتشافی انقلابات تو آپ کی سائنس ہی کی دنیا میں آتے رہتے ہیں۔ اور ہزار سال کے اندر لکھوکھا بار آ چکے ہیں۔ خدا کی خدائی کے مسئلہ سے آخر ان کا کیا تعلق؟ ـــــ آپ ہی کے سائنس والے پہلے کہتے تھے کہ عنصر ہیں۔ اب کہتے ہیں کہ قریب ۹۰ کے ہیں۔ ایٹم پہلے آپ ہی کہتے تھے کہ ناقابل تجزی ہے۔ اب کہتے ہیں کہ تجزی پذیر ہے۔ زمین آپ ہی کے بزرگان سائنس کبھی کہتے تھے کہ ساکن ہے، پھر کہنے لگے گردش میں ہے۔ صدہا ہزارہا مثالیں جتنی بھی آپ "ترقیوں" اور "انکشافات" کی پیش کریں گے سب کا تعلق آپ کی فزکس سے، کیمسٹری سے، بیالوجی یا باٹنی یا زوالوجی ہی کے قسم سے ہوگا۔ مذہب سے ان کا دور کا بھی تعلق نہ ثابت ہوگا۔ خدا پرستوں کے دعوے تو بس اس قسم کے ہیں کہ ہر قدرت پر خدا کی قدرت غالب ہے، ہر معلوم پر خدا کا علم محیط ہے۔ ہر تقدیر الٰہی حکیمانہ ہے، ہر زندگی اور ہر موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہر ہدایت کی جزا اور ہر ضلالت کی سزا وہی دے گا۔ ہر مخلوق کے لئے ایک یوم حشر مقرر ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ فرمایئے ان میں سے کسی چیز کو آپ کی گزند آپ کی "تحقیقات عالیہ" سے پہنچایا پہنچ سکتا ہے؟

(حاشیہ صفحہ ھذا) ۵۱ اس مسلسل بدزبانی پر صبر کی تعلیم بھی مذہب ہی کی ہدایت ہے۔

۵۲ اپنی شرافت و صداقت کا واسطہ، ذرا ایک ہی چیز کا نام ارشاد ہو جائے جو خدا کی قدرت سے نکل کر بندہ کی قدرت میں آ گئی ہے! ـــ کیا انسان اپنی تقدیر کا مالک ہو گیا؟ کیا انسان، گرمی، سردی، سختی، نرمی کے احساس سے بے نیاز ہو گیا؟ کیا زمان و مکان کے قیود انسان کیلئے بے معنی ہو گئے؟ بھوک، پیاس، نیند، آرام، جنسی آسودگی، ان سب طبعی احتیاجوں سے اسے آزادی مل گئی؟ مسرت، غم، خوف، دہشت، حیرت، وغیرہ جذبات کا تسلط اس کے اوپر سے اٹھ گیا؟ مادہ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو عدم سے وجود میں لانے پر وہ قادر ہو گیا؟ کسی ایک بیماری کا بھی حکمی اور سو فی صدی قطعی علاج دریافت ہو سکا ہے؟

۵۳ اس سے بڑھ کر مظاہر جہل کتر ہی کسی پڑھے لکھے کے قلم سے ہو سکتا ہے؟ ابتدائی" سائنس نہیں "انتہائی" سائنس کی بھی کتابیں کیا کہیں یہ بتاتی ہیں کہ اسباب بارش کو فراہم کون کرتا ہے؟ کیا سائنس کسی ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ کی بھی علت فاعلی کو بتاتا ہے؟ ـــ "بارش کیونکر ہوتی ہے"۔ کیا یہ مسئلہ بھی مذہب کے نزدیک کوئی قابل بحث ہے؟ فلاں درجہ کی گرمی، فلاں قسم کی ہوا وغیرہ جن اسباب طبعی کے اجتماع سے بھی بارش ہوتی ہو، مذہب نے اس سے کب انکار کیا ہے اور انکار کی وجہ بھی اسے کیا ہے؟ اس کا سوال تو صرف اتنا ہے کہ ان سارے متفرق اسباب کو سببیت پر موثر ہونے پر مجبور کس نے کیا ہے؟

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

یہ ساری دنیا مادے اور توانائی کی بنی ہوئی ہے[۵۱]۔ اس طرح یہ پوری کائنات خدا ہے، مختلف موجودات اس کے مظاہر ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں[۵۲]۔ یہ سب جھوٹ ہے کہ عرش اعلیٰ پر کوئی نظام عالم کا سنبھالنے والا بیٹھا ہے[۵۳]۔ اگر جھوٹ نہیں تو وہ اونگھ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ کسی چیز سے اس کی بیداری کا پتہ نہیں چلتا[۵۴]۔ پہلے تو وجود ہی نہیں ملتا۔ میری اس بحث کے بعد مزید بحث کیلئے گنجائش نہیں رہتی اس لئے میں فرض کئے لیتا ہوں کہ ایک خدا ہے اسی نے دنیا بنائی، رسول بھیجے، کتابیں اتاریں، مذہب کی تعلیم دی اور عبادت کی تلقین کی وغیرہ۔ آیئے دیکھیں کہ رسول کون تھے؟ کتابوں کی حقیقت کیا ہے؟ عبادت کا مقصد و مفہوم کیا ہے؟[۵۵]

میرے نزدیک[۵۶] اسلام نام ہے (Equality, Brotherhood, Fraternity) کی تعلیم کا۔ جمیع انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کا۔ جملہ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کرنے کا۔ ترک رسوم کا۔ تفریق قومی مٹانے کا۔ اصلاح اعمال کا۔ تزکیۂ اخلاق کا اور نفس کا۔ اخلاق حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان دنیا کے نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت سے رہے، دوسروں سے ہمدردی کرے۔ ابنائے جنس کے نظام عمرانی میں ایک فرد مفید ہو کر زندگی بسر کرے اور انسانی و ذاتی اغراض کے لئے اخوت عامہ کو متاثر نہ کرے۔ اسلام کی تعلیم کا اصل مقصود اخلاق حسنہ پیدا کرنا ہے[۵۷]۔ عبادت کا تعلق اپنے اصلاح نفس سے ہے، خدا کی خوشنودی سے نہیں[۵۸]

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ سارے اسباب اپنی فعلیت پر خود بخود مجبور ہیں۔ گویا آپ نے اتنے اسباب کو بہ یک وقت خدا یا نیم خدا مان لیا۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ نہیں یہ سارے اسباب تابع و محکوم ہیں ایک ہمہ قدرت و ہمہ حکمت قوت ارادی (Will Power) کے۔ وہی ان اندھے، بہرے اسباب سے مناسب وقت پر مناسب مقدار میں مناسب طریقے سے کام لیتی رہتی ہے ـــــ اب ان دونوں نظریوں میں عقل سلیم کو جو قابل قبول نظر آتا ہے وہ کسی پر بھی مخفی نہیں۔

(حاشیہ صفحۂ ھذا) ۵۱ اور خود یہ مادہ اور قوت، خود آفریدہ اور غیر مخلوق ہیں۔ اس کا بار ثبوت آپ پر ہے۔

۵۲ اور مذہب یہ کہتا ہے کہ یہ بڑے اور چھوٹے جتنے بھی موجودات و مظاہر ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی "خدا" بننے کی ادنیٰ صلاحیت بھی نہیں۔ البتہ ان سب کے عقب میں، ان سب سے ماورا ایک غیبی ہستی ہے جو ہمہ حکمت و ہمہ قدرت ہے اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب اسی کے ارادہ کا ظہور ہے۔

۵۳ لیکن یہ جھوٹ تو اس سے بھی بڑھ کر صریح اور مضحکہ انگیز ہے کہ اٹل قوانین موجود ہیں لیکن قانون ساز کوئی نہیں۔ نظام اعلیٰ موجود ہے لیکن ناظم معدوم۔ صناعی کے نمونے بہتر سے بہتر موجود صناع کے وجود کے بغیر!

۵۴ اس اندھے ملحد کو یہ بھی نہ یاد رہا کہ ابھی ابھی وہ "نظام عالم" کو تسلیم کر چکا ہے اور کچھ اوپر ترتیب ذرات و قوانین قدرت کا اقرار صاف صاف کر چکا ہے!

۵۵ لیکن ان فصلوں کی بنیاد کیا ہوگی اور کس معیار پر یہ مسئلے حل کئے جائیں گے! ـــــ یا محض عامیانہ اٹکل یا ظن و تخمین ہر سوال کے جواب کے لئے کافی ہو جائے گی!

۵۶ یہ "میرے نزدیک" کا معیار خوب ہاتھ آگیا۔ اس کے بعد ضرورت نہ کسی دلیل عقلی کی رہی نہ دلیل نقلی کی!

۵۷ اور خود "اخلاق حسنہ" کی تعریف کیا ہے؟

۵۸ عجب منطق ہے! گویا یہ دونوں مقاصد ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے! ـــــ کیا خود اصلاح نفس ہی اس لئے مقصود نہیں کہ وہ ایک فرد رضائے الٰہی کی ہے؟

خدا زمان و مکان کی قید سے علیحدہ ہے، احساس و تاثر سے بیگانہ ہے، بے نیاز مطلق ہے، وہ مسجد سے خوش ہوتا ہے نہ مندر سے۔ اذان سے متاثر ہوتا ہے نہ ناقوس سے۔ زنار و تسبیح سے وہ بالاتر ہے۔ اس کو ہماری کسی چیز کی ضرورت نہیں، ہم پانچ وقت کی نہیں پچاس وقت کی نمازیں پڑھ لیں اس کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ کوئی بجائے حمد و ثنا کے دن بھر گالیاں دے لے اس سے اس کو کوئی نقصان نہیں ہوتا وہ بے نیاز مطلق ہے جب وہ بے نیاز ہے تو پھر کیوں اس کو ہماری عبادت کی ضرورت ہے؟ کیوں ہمارے عجز و نیاز کا متمنی ہے؟ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا تو ہماری نافرمانی سے کیوں متاثر ہوتا ہے[۵۱]؟ وہ رحم کرنے والا ہے تو گناہگاروں کو سزا کیوں دیتا ہے[۵۲]؟ وہ عادل ہے تو عدل کا پابند کیوں نہیں[۵۳]؟ وہ تاثرات و جذبات سے بیگانہ ہے تو انعام و انتقام کے جذبات اس میں کیوں ہیں؟ کیا اس طرح کی باتیں کرکے مذہب والے اس کو مجموعۂ اضداد نہیں بتا رہے ہیں، خوشی، برہمی انعام و اکرام کے جذبات کا اظہار کرکے کیا آپ اس کو انسانوں کی صف میں نہیں کھڑا کر رہے ہیں[۵۴]۔

مذہب اسلام کے پیرو سب سے بڑی غلطی عبادت کے مفہوم کو سمجھنے میں کرتے ہیں۔ پھر طرہ یہ کہ اسی مفہوم کو لیکر مقصد حیات سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کتنی لغو بات ہے کہ انسان عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور عبادت نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہے مخصوص مراسم و رواج متعین و معین حرکات کی نماز، مقررہ وقت کا روزہ، مقررہ مقدار کی زکوٰۃ، انتہائی ذیلی چیزیں اور ان کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے تعجب ہے۔[۵۵]

عبادت کا مفہوم وہی ہے جو میں نے اس باب کی ابتدا میں بیان کیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ خدا کی خوشنودی اور برہمی کا مطلب خود انسان کا نفع و نقصان ہے۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر انسان کا ایسے فعل کا ارتکاب جس سے مفاد عامہ کو نقصان ہو، مرکزیت کو دھکا پہنچے اور سالمیت متاثر ہو اور اشتراک عمل تباہ ہو خود یا افراد کی تباہی کا باعث ہے جس کو آپ خدا کی برہمی کہتے ہیں اور فرد یا افراد نظام عمرانی میں ایک مفید عضو کی طرح زندگی بسر کریں تو اس میں ان ہی کی فلاح ہے جس کو آپ خوشنودی خداوندی یا رحمت و برکت کہتے ہیں۔[۵۶]

اصلاح اعمال، تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس کے کام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مخصوص حرکات و مقررہ اوقات کی نماز روزہ سے

---

۵۱ اس کا تاثر بھی ارادی و فاعلی ہے یہ کس نے کہہ دیا کہ وہ طبعاً و اضطراراً متاثر ہوتا ہے جس طرح بشر ہوتا رہتا ہے؟

۵۲ وہ جس طرح رحیم کل ہے حکیم کل بھی ہے — سزا کی غایت مجرموں کی اصلاح اور دوسری بیسیوں تکوینی مصلحتیں ہیں۔

۵۳ یہ کس نے کہہ دیا کہ معاذ اللہ وہ پابند عدل نہیں ہے۔

۵۴ ہرگز نہیں۔ اس کے تمام تاثرات بھی ارادی اور ہمیشہ حکمتوں اور مصلحتوں سے لبریز ہوتے ہیں۔

۵۵ اور اس سے کہیں بڑھ کر تعجب انگیز یہ عبارت ہے کہ مذہب کے اصول و کلیات کی تصدیق کئے بغیر، ان پر اعتقاد رکھے بغیر مذہب کے فروع و جزئیات پر مدعیانہ رائے زنی شروع کر دی جائے۔

۵۶ دونوں اصطلاحوں کے درمیان فرق خاص و عام یا جزو کل کا ہے۔ آپ کمال سطح بینی سے نفع عبادت کو اس مادی دنیا تک محدود رکھتے ہیں، اور وہ بھی صرف فوری نتائج تک۔ ہم اس نفع کو ابدالآباد تک وسیع سمجھتے ہیں، اور نزدیک و دور کے سارے پہلوؤں پر حاوی۔

ہی ہوسکتی ہے، مہمل بات ہے اور یہ اس سے زیادہ مہمل بات ہے کہ نماز روزہ خدا کے لئے ہے، ان کی اس کو ضرورت ہے اور سب سے زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ سب سے پہلے نماز کے بارے میں استفسار ہوگا۔ وغیرہ ؟

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ اصلاح و اعمال کا ایک ذریعہ ہیں لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے اس کے سوا بھی دوسرا ذریعہ ہوسکتا ہے یا اس پر کاربند ہوئے بغیر بھی اصل مقصد تک جانا ممکن ہے! اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ نماز جو آپ حضرات پڑھتے ہیں ایک ذیلی و جزوی چیز ہے اور اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اس کو غیر ضروری بھی قرار دیتا ہوں اس طرح کی نمازوں میں وقت ضائع کر کے آپ نہ صرف اپنی بدخدمتی کر رہے ہیں بلکہ قوم اور خدا کی بھی۔ نمازیوں کی یہ خود غرضی ہے کہ وہ نماز خدا کی خوشنودی کے لئے پڑھیں یا خوشامد کیلئے تاکہ انھیں آخرت میں جنت ملے۔ [2]

مذہب کے پیروؤں کی کورانہ تقلید نے انھیں بہت پیچھے دھکیل دیا۔ اگر عبادت کا صحیح مفہوم سمجھایا جاتا کہ عبادت سے خوشنودی کا مطلب خود افراد کی فلاح و ترقی ہے اور خدا اسی اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے تو آج دنیا کی حالت دوسری ہوتی۔ دنیا میں اس وقت مسلمانوں کی آبادی ۴۰ کروڑ ہے یعنی پوری دنیا کی آبادی کا ⅕ حصہ مسلمانوں سے بھرا ہے۔ اتنی بڑی اکثریت میں ہو کر بھی وہ اس قدر پست ہیں! اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے دنیا کو عارضی جان کر کوئی کوشش بقائے قوم کی نہیں کی۔ مذہب نے خطرناک ترین تعلیم یہ دی کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے، اصل زندگی دوام مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے جس کو حقیقت میں سنوارنے کی ضرورت ہے۔ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہمی تعاون و ہمدردی و اصلاح کا خیال کرے گا۔ [3]

نماز کا طریق عبادت بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے لیکن وہاں بھی ہر شخص عاقبت کو پیش نظر رکھ کر انفرادی نجات کیلئے کوشاں رہتا ہے۔ اجتماعی اصلاح کا کسی کو خیال نہیں ہوتا۔ نمازی ایک دوسرے کے بازو میں رہ کر ایک دوسرے کے دکھ درد سے ناآشنا ہوتے ہیں کبھی زمانے میں مسجدیں دار الاجتماع ہوتی تھیں جہاں قوم کے تمام دنیوی مسائل سلجھائے جاتے تھے لیکن آج کے خود غرض بدمعاش ملّا مولوی مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی بات کرنا حرام قرار دیتے ہیں، یعنی وہ چیز حرام قرار دی جارہی ہے جس کو بانیٔ اسلام نے خود کیا تھا۔ مذہب

---

[1] اور جہلیت، لغو بیانی اور بیہودہ نگاری کا پست ترین درجہ یہ ہے کہ بلا کسی دلیل عقلی و نقلی کے مجرد جہل کے سہارے ان حقائق ایمانی سے انکار پر انکار ہوتا چلا جائے!

[2] الحاد کا شاید سب سے زیادہ مضحک اثر یہ ہوتا ہے کہ عقل بھی بالکل ماری جاتی ہے۔ کہاں ابھی تو شروع سے بیان یہ ہو رہا تھا کہ نماز اور عبادتیں اپنے ہی نفع کے لئے ہوتی ہیں اور کہاں ابھی زبانِ طنز سے یہ ارشاد ہونے لگا کہ نمازیوں کی یہ "خود غرضی" اور "خوشامد" ہے کہ وہ نماز کو جنت یعنی مستقل اور ابدی نفع کے لئے پڑھیں!!

[3] بالکل اور سولہ صدی صحیح ارشاد ہوا! ــــ دیکھئے نہ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور ان کے سارے ہمعصر آخرت سے لگے لپٹے رہے اور انسان کو فانی سمجھتے رہے تو دنیا میں کیسے حقیر و خوار ہو کر رہے! نہ ایک انچ زمین فتح کر سکے، نہ اپنے کسی دشمن کو نیچا دکھا سکے، نہ حجاز خاص، نہ نجد و یمن، نہ عراق، مصر، شام، فلسطین، نہ ایران و توران میں کہیں بھی اپنے جھنڈے گاڑ سکے۔ نہ کسی کو بھی تہذیب و تمدن کا سبق سکھا سکے! سکھاتے بھی کیسے دن رات نماز روزہ سے فرصت کسے تھی! ــــ تاریخ سے "اتنی" اور "ایسی" واقفیت ہر ایک کے نصیب میں کہاں آسکتی ہے؟

کی اصلی تعلیم کو خود غرض مُلاؤں نے اور اندھی تقلید کرنے والے پیروں نے برباد کیا۔ باطل عقیدے، بے بنیاد اعتقادات داخل کئے گئے، اصلی خدوخال پر گھناؤنے پردے پڑتے رہے اور آج کا اسلام بدنام ترین اور ناقابلِ فہم و ناقابلِ عمل بن گیا ہے۔ مذہب سے عقل کو یا عقل سے مذہب کو جدا کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں [۱] یعنی آپ بے عقلی کا پروپیگنڈا کرنا چاہتے ہیں [۲]۔

میں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو آپ کے یعنی آج کے تمام مسلمانوں کے عقائد سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں سے ۹۹ فی صدی باطل، بے بنیاد، لغو، مہمل اور ناقابلِ فہم ہیں۔ کوئی پوچھے کہ یہ کیونکر ہے تو جواب ملتا ہے کہ مذہب میں حجت کی گنجائش نہیں، اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ایسا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا [۳]۔ انکار کرنے والا کافر۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ اسلامی لٹریچر کی مستند کتابیں بھی اسی طرح کی بے بنیاد باتوں کو روا رکھتی ہیں کسی مستند کتاب کو لیجئے، انعام، اکرام، قہر و عذاب یا جنت و دوزخ یا معجزے وغیرہ کی بابت پڑھئے اور خود تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کس حد تک لکھی ہوئی باتیں قابلِ فہم ہیں۔ اعتقاد اسی سانچے میں ڈھلے ہوں تو خیر سب کچھ ٹھیک معلوم ہوگا لیکن کیا وہ کسی معترض کی سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

اچھا آیئے اب کچھ رسول و قرآن کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ رسول ہم جیسے ہی انسان تھے۔ اب ان لغویات کو ملاحظہ فرمایئے جو رسول کی ہستی کو انسانوں کی صف سے جدا کرتی ہے یہ کہ ان کا سایہ نہیں ہوا کرتا تھا [۴]۔ خوش اعتقادی کو چھوڑیئے۔ غور کیجئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان کا سایہ نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ ان کے سر پر ایک ابر سایہ کیا رہتا تھا۔ بتایئے کہاں تک صحیح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بول و براز کو زمین شق ہو کر نگل جاتی تھی۔ بعض وقت وہ دشمنوں کو نظر نہ آتے۔ یا چاند اشارے سے دو ٹکڑے ہوا [۵]۔ یا اتنی دیر میں ساتوں آسمانوں کی سیر کی، وہاں سب سے ملاقات کی کہ وضو کیا ہوا پانی بہہ رہا تھا [۶]۔ کیا یہ کسی

---

[۱] یہ کس بد عقل نے آپ کے کان میں پھونک دیا۔ مسلمان تو مذہب اور عقل دونوں کے حدود متعین کرتا ہے اور دونوں کو اپنے اپنے صحیح مرتبہ و مقام پر رکھتا ہے۔ قرآن بھرا پڑا ہے لعلہم یتفکرون، افلا تعقلون کی تکرار سے۔

[۲] جس طرح آپ نے یہ لامذہبی کا پروپیگنڈا اپنے ذمے لے لیا ہے۔

[۳] اتہام اور بے دھڑک اتہام شاید آپ کے مذہب میں بالکل جائز ہے؟ ـــــ ورنہ یہ کس مستند عالم نے مطلق صورت میں لکھا ہے کہ "مذہب میں حجت کی گنجائش نہیں"۔ اسلام تو اپنے بنیادی اصول یا عقائد میں عین عقل کو دعوت ہی دیتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے صرف یہ ہے کہ اصول کو مان لینے کے بعد جزئیات احکام کو اپنے ظن و تخمین کا پابند نہ رکھو۔ ماہرِ فن انجینیر سے تعمیر کے مسئلہ میں یا ماہرِ فن ڈاکٹر سے اس کے نسخہ کے بارے میں کسی عامی کا الجھنا عین بدعقلی ہی ہے نہ کہ عقلمندی۔ ان جزئیات کیلئے ماہرِ فن کی محض مہارت و حذاقت پر اعتماد کیا جائے گا۔

[۴] تو یہ کہئے۔ اب آپ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر نور نامہ اور مولود شہیدی اور قصص الانبیاء کی سطح پر اتر آئے! ـــ بیشک یہی معنی ہیں "تحقیق" کے۔

[۵] جو لوگ اس معجزہ کے قائل ہیں، وہ بھی صرف یہ کہتے ہیں کہ رسول نے نہیں، چاند کے پیدا کرنے والے نے کسی مصلحت تکوینی سے کسی خاص موقعہ پر چاند کا شق ہو جانا کر دکھایا ـــ اگر قادرِ مطلق کیلئے یہ چیز ناممکن تھی تو اس عدمِ امکان کا بار ثبوت آپ کے ذمہ۔

[۶] اس ریڈیو اور (Rocket) اور (Radar) کے دور میں کسی جسم لطیف کے سرعت رفتار سے انکار اور اس کے عدم امکان کا دعویٰ بہت ہی پرلطف ہے! ـــ پہلی صدی ہجری، بلکہ قبل ہجرت کا جاہل عرب تو بیچارہ معذور محض تھا کہ اس کے سامنے اس قسم کی کوئی شے نہ تھی لیکن کمال حیرت اس پر ہے کہ یہ بیسویں صدی کا سائنس کی شد بد رکھنے والا انسان سرعت سیر کو ناممکن بتا رہا ہے

بنی نوعِ انسان سے ممکن ہے؟ یہ مسلم ہے کہ وہ ایک غیر معمولی ہستی کے مالک تھے لیکن کس معنی میں، عمل و کردار میں، ستودہ صفات اور اخلاقِ حسنہ میں۔ ایسی بیشمار روایات ہیں وہ بھی معتبر و محقق راویوں کی زبانی جو کبھی فہم و عقل میں نہیں آتیں[1]۔ کسی دوسرے مذہب والے کو بانیٔ اسلام کے یہ سب معجزے معلوم ہوجائیں تو وہ بھی کہے گا کہ وہ شخص جادوگر تھا یا اس کے پاس علاؤ الدین کا چراغ رہا ہوگا۔ ان لغو باتوں کے پروپیگنڈے سے مذہب و بانیٔ مذہب کی عظمت کو جو دھکا پہنچا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مخالف اسلام لٹریچر جس قدر موجود ہے اس قدر لٹریچر کسی اور مذہب کی مخالفت میں نہیں۔ کسی دوسرے مذہب کی مخالفت میں آپ کسی کتاب یا کسی لکھنے والے کا نام نہیں سنیں گے۔ لیکن اسلام کے بارے میں لکھنے والے بہت ہیں[2]۔ وجہ صرف یہی ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کو فراموش کرکے مسلمانوں نے بیہودگیوں کو عام کرنا چاہا اور کر رہے ہیں۔ اصل کو نظر انداز کرکے فروعات اور جزویات کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

آپ تعجب کریں گے کہ میں خدا کے وجود سے انکار کرتا ہوں لیکن محمدؐ کے وجود کو تسلیم کرتا ہوں[3]۔ محمدؐ کا وجود ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ وہ ایک قوم کے ہادی ہیں انھوں نے دنیا والوں کے لئے بہترین اصول معین کئے اور اس کو عام کیا۔ انسانی فلاح و اصلاح کے زبردست کام انجام دیئے، اس لئے ان کی عظمت مسلمہ ہے۔ آپ یہ کہیں گے کہ جب میں ان کی تعلیمات کو درست تصور کرتا ہوں تو پھر خدا، جنت، دوزخ، قیامت و آخرت، حیات بعد الموت سے کیوں انکار ہے۔

آپ اس سے واقف ہیں کہ جس زمانہ میں حضرت محمدؐ نے جنم لیا، وہ عربوں کی زندگی کا تاریک ترین زمانہ تھا۔ کوئی برائی ایسی نہیں تھی جس میں وہ مبتلا نہ تھے۔ ان تمام برائیوں سے ان کی نجات دلانے کے لئے بانیٔ اسلام کو ایک نئے ڈھنگ کی ضرورت تھی[4]۔ اگر جاہل عربوں کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ سمجھایا جاتا اور نوامیس فطرت کے اصول بتائے جاتے تو وہ کبھی اس کی طرف مائل نہ ہوتے، اسی لئے ان کی ذہنی پستی اور پست نفسیات کو دیکھکر انھیں اسی قسم کی تعلیم دی گئی۔ مابعد الطبیعیاتی عقائد جو مذہب اسلام نے بتائے ہیں وہ کوئی نئے نہیں، زمانۂ قدیم سے رائج تھے۔ اسرائیلیوں اور عیسائیوں کے پاس یہی عقائد تھے۔ عرب قوم جہالت و گمراہی میں اتنی غرق تھی کہ اس کو ان حالات میں کوئی نیا سبق دیا جاتا تو وہ اس کی طرف بہت کم مائل ہوتی۔ اس لئے ان ہی خیالات کی تجدید کی گئی۔

انھیں بتایا گیا کہ اگر وہ ان برائیوں سے دور رہیں گے تو انھیں آخرت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ جب تک حیات بعد الموت کا

---

[1] اول تو اصول و کلیات کے منکر کو فروع و جزئیات میں جانے کا حق ہی کیا ہے۔ لیکن بالفرض حق ہو بھی تو آخر وہ کون سے مستند معجزات ہیں جو آپ کی "عقل و فہم" کے اندر نہیں آتے؟ ـــــ سوال، سوچ سمجھیے، خلاف عقل ہونے کا ہے۔ تجربہ سے باہر ہونے کا نہیں۔

[2] یہ سارے فقرے ناواقفیت اور کم نظری نے لکھائے ہیں۔

[3] سبحان اللہ! کیا نادر نکتہ پیدا کیا ہے! ـــــ گویا ابوجہل و ابولہب سے لیکر مارگولیوس اور راجپال تک کسی بڑے سے بڑے معاند کو بھی "وجودِ محمدیؐ" میں شک رہا ہے!

[4] افسوس ہے کہ اس نقطۂ نظر میں بھی کوئی ندرت نہیں۔ بیسیوں مستشرقین رسولؐ کی زندگی و تعلیمات پر نظر اسی زاویے سے کرچکے ہیں۔

تصور نہ ہو اس وقت تک بدلہ یا اجر کا تصور نہیں ہو سکتا اس لئے آخرت کو لیا گیا۔ عرب قوم اپنی قوتیں جسمانی و شہوانی لذتوں میں صرف کیا کرتے تھے عیش و عشرت کا تخیل دودھ، شہد، شراب، عورت سے آگے نہیں بڑھتا تھا اور ان کو وہ بہت پسند کرتے تھے اسی لئے انہیں بتایا گیا کہ اگر وہ اس دنیا میں اچھے کام کریں گے تو آئندہ دنیا میں انہیں عورت کی جگہ حور ملے گی اور دودھ و شہد کی نہریں ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ جو کچھ کہا گیا ان کی ذہنیتوں کو سامنے رکھ کر کہا گیا تاکہ وہ راہ راست پر آئیں اگر بانیٔ اسلام نے اس موقع پر مصلحت پرستی سے کام لیا ہے تو کوئی برائی نہیں کی۔ اسی لئے کہ پوری قوم کو تباہی سے بچانے کیلئے یہی ایک طریقہ تھا۔ [۵۱]

قرآن کے بارے میں آپ سب کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو اللہ میاں نے وحی کے ذریعہ رسول کے پاس بھیجا ہے، اس کا ایک ایک لفظ خدا کا کہا ہوا ہے جس کو رسول نے بلا کم و کاست عوام کے سامنے دہرا دیا۔ ایسا عقیدہ رکھکر آپ حضرات دو غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں ایک تو یہ کہ اپنے خدا کی عظمت کو دھکا پہنچا رہے ہیں[۵۲]۔ دوسرے یہ کہ رسول کو عام درجے کے انسانوں سے بھی نیچے لا رہے ہیں یعنی رسول ایک طوطا ہے جس کو خدا نے اپنا کلام رٹایا ہے اور وہ آپ کے سامنے (Repeat) کر رہا ہے[۵۳]۔ وہ اپنی عقل سے کام لیتا ہے نہ ارادے سے بس جو خدا کہلواتا ہے کہتا ہے[۵۴]۔ آپ رسول کو ایک مصلح قوم تو مانتے ہیں لیکن ایک ایسا مصلح جو وقت اور ماحول کے تقاضہ کی بنا پر خود کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اپنی ذاتی عقل کے استعمال کا مجاز نہیں وہ ایک ایسا سپہ سالار ہے جو میدانِ جنگ میں ہے، جنگ کا پورا نقشہ سامنے ہے لیکن کوئی حکم دینے سے مجبور[۵۵]۔ رسول کی عظمت اور بزرگی کا یہی اقتضاء ہے کہ قرآن کو ان کا کلام سمجھا جائے اگر واقعی خدا کا کلام ہے تو آیئے اس پر بھی غور کریں۔

قرآن کے بارے میں آپ سب کا عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ وحی فرشتے لاتے تھے یا خود بخود ہوتی تھی، وحی کے معنی سمجھنے میں عام طور پر غلطی کی گئی ہے۔

---

[۵۱] تو خلاصہ یہ کہ

(۱) اول تو رسولِ اسلام کے پیش نظر صرف عرب کی اصلاح تھی اور وہ بھی صرف معاصر عرب کی۔

(۲) دوسرے یہ کہ (نعوذ باللہ) آپؐ اس مقصد کے لئے نہ اختفائے حق میں کوئی مضائقہ سمجھتے تھے نہ اختراع مسائل میں! خدا تک پر تہمت گھڑ لینے میں (نعوذ باللہ) آپؐ کو کوئی باک نہ تھا! ـــــ بعینہٖ اور جہل کا یہ عالم کہ بعینہٖ جو شے مذاق عرب سے سب سے زیادہ دور تھی، یعنی جزائے آخرت، اسی کو یہ شخص کہہ رہا ہے کہ پیمبر نے تفہیم مخاطبین کی آسانی کے لئے اختیار کر لیا تھا!

[۵۲] وہ کیونکر؟ ـــــ پورا فقرہ بے معنی ہے۔

[۵۳] خدائی سفارت کے منصب کو طوطے کی سطح پر لا کر یہ شخص خود اپنے جہل مرکب کا پردہ فاش کر رہا ہے۔

[۵۴] اس خوش فہم کے نزدیک امانت و اخلاص کامل کے ساتھ کسی بڑے کا پیام چھوٹوں تک پہنچانا۔ پیامبر کی توہین و تنقیص ہے؟ اور پھر پیام بھی کس بڑے کا؟ جس کے آگے ہر بڑے سے بڑا بھی چھوٹا ہی ہے۔

[۵۵] اس جاہل کے نزدیک حدیث نبویؐ کے جو دفتر کے دفتر موجود ہیں وہ سب معدوم کے حکم میں داخل ہیں اور رسول کریمؐ کے ہزار ہزار اقوال و افعال جو دنیا میں بچہ بچہ کو معلوم ہیں، وہ گویا سرے سے موجود ہی نہیں!

وحی کے معنی برمحل سوجھ بوجھ کے ہیں۔ اس میں کسب و اکتساب کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس ذہنی قوت کا نتیجہ ہے جو انسان میں ودیعت کی گئی ہے۔ وحی کا یہ مفہوم خود قرآن سے ملے گا۔[۵۱] سورۂ قصص میں ہے "ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰؑ کو دودھ پلائیں"۔ موسیٰؑ کی ماں نبی تو نہیں تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے جی میں یہ بات ڈالدی گئی کہ وہ موسیٰؑ کو دودھ پلائیں۔ انسانوں پر بھی نہیں بلکہ حیوانوں پر بھی وحی بھیجنے کا قرآن میں ذکر ہے۔ سورہ نحل میں ایک جگہ ہے "ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتہ بنائے"۔ یہاں وحی کا مفہوم ذکاوت سے ہے۔ وحی قرآن میں بری باتوں کے لئے بھی استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے "اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ ان کے دشمن لگا رکھے ہیں۔ اور وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں"۔

وحی و الہام کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال کئے گئے ہیں جس کو غالباً اکثریت نے محدود بنا دیا اور اس لفظ کا تعلق صرف خدا اور رسول و قرآن سے کر دیا گو سورۂ انعام میں رسول کی زبانی یہ الفاظ کہے گئے ہیں "مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا"۔ لیکن کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے ہیں۔ اس میں جو حکمت و علم کی باتیں ہیں وہ وحی کی گئیں۔ عام طور پر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن کو خدا نے ازل سے لوح محفوظ میں محفوظ رکھا ہے یعنی اس وقت سے ہے جب سے خدا ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن بھی خدا کی طرح[۵۲] قدیم ہے۔ قرآن عربی زبان میں ہے تو ظاہر ہے کہ خدا بھی عربی جانتا ہے[۵۳] یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم[۵۴] ہے۔ حالانکہ وہ ایک مخصوص ملک کی زبان ہے اور اس کا وجود آفرینش حیات کے بہت بعد عمل میں آیا[۵۵]۔

توریت، زبور، انجیل جن زبانوں میں ہیں خدا ان سے بھی واقف ہوگا۔ کیونکہ وہ بھی خدا ہی کی کتابیں ہیں[۵۶]۔ کوئی زبان کیونکر وجود میں آئی ہے وہ تو آپ پر واضح ہوگی۔

قرآن جس ترتیب سے نازل ہوا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل علیحدہ ہے یعنی ہمارے سامنے جو قرآن ہے وہ لوح محفوظ کے قرآن سے بالکل مختلف ہے[۵۷]۔ حالانکہ خدا کے کلام میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہونا چاہئے۔ قرآن مجید مجملاً مجملاً نازل ہوا۔ مختلف آیات خاص وقت اور خاص حالات کے مطابق نازل ہوئیں یعنی جب تک وہ خاص وقت نہیں آیا وہ آیت بھی نہیں تھی اس لئے یہ خیال کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج ہے[۵۸] بے معنی ہوگا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ خدا غیب کی باتیں جانتا ہے اس کو معلوم تھا کہ آئندہ کیا ہونیوالا ہے

---

۵۱ اور قرآن میں یہ بھی ملے گا کہ لفظ وحی صرف انھیں معنوں میں آئے گا، جو آگے نقل ہو رہے ہیں!!

۵۲ اور قرآن یا کلام الٰہی ہی نہیں، بلکہ ہر صفت الٰہی اس معنی میں قدیم ہی ہے۔

۵۳ کیا نادر نکتہ ارشاد ہوا ہے! — جی نہیں خدا عربی کہاں جانتا ہے!

۵۴ "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"! — عجب نہیں جو اس حسن استدلال پر خود فن منطق کو وجد آجائے!

۵۵ اور چونکہ اس دنیا میں فلاں زبان کا وجود بہت بعد کو ہوا، لہٰذا علم الٰہی بھی اس سے عاری اور کورا تھا۔

۵۶ جی نہیں۔ خدا بھلا زبانوں سے کہاں واقف ہو سکتا ہے!! کیسی ناممکن باتیں آپ فرض کر رہے ہیں؟

۵۷ وہ لوح محفوظ جس کو آپ بجنسہ پڑھ آئے ہیں!! ۵۸ چونکہ نزول آیات متفرق طور پر حسب ضرورت و مصلحت ہوا ہے اسلئے ناممکن ہے کہ لوح محفوظ میں اسی طرح درج ہو!! — اس خوش منطقی پر فرمایئے کہ ہنسی آئے یا طبیعت غصہ سے بیخود ہو جائے۔

اس لئے اس موقع کے لئے پہلے ہی سے ازل سے آیات لکھ رکھی تھیں تو ان واقعات کے بارے میں کیا خیال ہے جن کو قرآن میں اس انداز سے بیان کیا گیا ہے گویا وہ گذر چکے ہیں۔ یعنی قرآن سے پہلے ہو چکے ہیں۔ قرآن میں اکثر ان واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نبی کریمؐ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر قرآن ازل سے ہے تو اس کا مطلب یہ کہ ان واقعات کا واقع ہونا طے ہو چکا تھا اور قرآن کی حیثیت ایک پیشین گوئیاں رکھنے والی تاریخی کتاب کی ہے۔ ۵۱

قرآن کے اسالیب بیان سے واضح ہے کہ کہیں رسول خداؐ نے خود اپنے نفس سے خطاب کیا ہے۔ کہیں خدا کو مخاطب کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے کسی جگہ اپنے ابنائے قوم واحباب و دشمنوں کو مخاطب کیا ہے اور کسی جگہ ایسا انداز اختیار کیا ہے گویا خدا خود کہہ رہا ہے ان اسالیب بیان سے ظاہر ہے کہ ان کا مقصد کسی نہ کسی طرح اصلاح اعمال تھا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی فصاحت اس زمانہ کے مشہور سے مشہور ادیبوں نے بھی تسلیم کی اور اس کو غیر انسانی کلام قرار دیا۔ رسول کا تعلق عرب کے ایک مشہور خاندان سے تھا جو فصاحت و بلاغت و پاکیزگیٔ بیان میں مشہور تھا۔ گو رسولؐ اَن پڑھ تھے لیکن زبان شستہ تھی۔ اگر قرآن کی زبان فصیح ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ۵۲ مسجع کلام استعمال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عرب اس زمانے میں مسجع کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔

سیرت کے مطالعہ سے آپ پر بھی واضح ہو گا کہ عرب قوم کی گمراہی سے حضرت محمدؐ کس قدر متاثر تھے۔ وہ کتنی کتنی دیر غار حرا میں بیٹھ کر اصلاح کی فکر کرتے۔ مسلسل غور و فکر کے بعد غار حرا سے جب تشریف لاتے تو آپ کا سینہ جذبات سے بھرا رہتا۔ قوم کی یہ ابتر حالت دیکھی نہ جاتی۔ پھر غور کرنے پر غور کرتے۔ آخر اس مسلسل غور و فکر اور قوم کو درست کرنے کے آہنی عزم نے ایک سیلاب کی صورت اختیار کی۔ جذبات و تاثرات کے طوفان نے الفاظ کی صورت اختیار کی اور قرآن وجود میں آیا۔ ۵۳

عذاب قبر، منکر نکیر، حشر، میزان، صراط، جنت و دوزخ، حور و قصور کا بیان جس انداز میں قرآن میں کیا گیا ہے وہ سب عربوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔ ۵۴

عام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ایک حیات بعد الموت بھی ہے۔ مجھے اس سے بھی انکار ہے۔ بعد الموت حیات کو صرف عربوں کو ۵۵

---

۵۱ گویا زمانہ کی تقسیمیں ماضی، حال و مستقبل جس طرح ہندوؤں کے لئے ہیں، خدا کے لئے بھی ہیں!!

۵۲ کلام الٰہی اور کلام رسول (حدیث) کے درمیان جو فرق آسمان و زمین کا ہے وہ بھی اس جاہل کو نظر نہ آیا! ـــــ اور پھر فصاحت و بلاغت والے مشہور خاندان کے فرد کیا ایک محمد بن عبداللہ ہی تھے۔ بیسیوں دوسرے عین اس زمانہ میں نہ تھے؟

۵۳ اور بہ کمال بیباکی اپنی تصنیف کو (نعوذ باللہ) آپؐ نے گھڑ کر اللہ کی جانب منسوب کر دیا۔

۵۴ حقائق دین و معارف ایمان تو بڑی چیزیں ہیں۔ یہ بیچارہ تو تاریخ عرب سے بھی جاہل مطلق ہے۔ عربوں کو انھیں چیزوں سے شد و مد سے انکار تھا۔ یہ چیزیں اگر ذرا بھی ان کے مذاق کی ہوتیں تو آخر جدال و قتال کی نوبت ہی کیوں آتی۔

۵۵ اور چونکہ اس ذکر کی مصلحت و حکمت یہ تھی اس سے ثابت ہو گیا کہ واقعیت یہ نہ تھی! ـــ کیا اچھا منطقی نسخہ مل گیا کہ چونکہ فلاں چیز کے بیان کی غایت و حکمت یہ ہے اس لئے اس چیز کا وجود فرضی غایت موہوم۔

راہ راست پر لانے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ اگر وہ راہ راست پر آئیں تو انھیں اس کا بدلہ جنت کی صورت میں ملے گا، اور نہ آئیں تو دوزخ کی صورت میں۔ اب بدلہ کیلئے ایک دوسری حیات کی ضرورت تھی اس لئے دوسری دنیا کے تصور کو پیش کیا گیا۔ قرآن میں جو مابعد الطبیعاتی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ حقائق کی صورت میں نہیں ہے بلکہ صرف تمثیل اور تعبیر ہے کیونکہ انسانی ذہن مادیات سے ہٹ کر جزا و سزا کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کو سمجھانے کے لئے مثال میں ان ہی چیزوں کو پیش کیا جائے جن کو وہ روز دیکھتا ہے اگر حضرت محمدؐ لوگوں کی عام ذہنیت سے ہٹکر جزا و سزا کا وہ فلسفہ پیش کرتے جو اُن کا مقصود نظر تھا تو اس سے کوئی فائدہ نہ نکلتا[۱]

آخرت کی زندگی کو ماننے کیلئے کوئی معقول وجہ نہیں۔ اس حیات کے سلسلہ کو جاری رکھنے سے انسانی حیات اور تمدن کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے[۲]۔ سزا و جزا اس وقت تصور میں لائے جا سکتے ہیں جبکہ اس عمل سے باز رکھنا ہو جس کی سزا دی جا رہی ہو[۳] جب اس دار العمل میں ہی آنا نہیں ہے تو سزا جزا کے کیا معنی۔ خود قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اس دنیا کے بعد کوئی دنیا نہیں[۴] کہیں تمثیل دی گئی ہو تو اور بات ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے "جن لوگوں نے شقاوت کی وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جبتک کہ آسمان و زمین کا وجود ہے" اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین کا وجود ہے۔ کیا عذاب و ثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے میں اور کسی دلیل کی ضرورت ہے؟ جب تک کہ آسمان و زمین کا وجود ہے" کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ عذاب و ثواب کو عالم آخرت سے تعلق رکھنے والا بتائیں گے تو پھر زمین و آسمان کے وجود کے الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں کیونکہ اس وقت یہ زمین وغیرہ تو کچھ نہیں ہوں گے۔[۵]

اسی طرح دوزخ کی آگ کو قرآن میں کہا گیا ہے کہ "دوزخ کی آگ وہ خدائی آگ ہے کہ جو انسانوں کے دلوں پر مستولی ہوتی ہے" اگر دوزخ کی آگ اس دنیا کی آگ کی طرح ہوتی تو اس کو نار اللہ نہیں کہا جاتا اور نہ وہ دلوں سے تعلق رکھتی۔ ظاہر ہے کہ دل کی آگ وہی ہو سکتی ہے جو انسان کو روحانی کرب میں مبتلا کرے اور ظاہری آگ سے اسے کوئی تعلق نہیں[۶]۔ سورۂ سجدہ کی ایک آیت ہے

---

[۱] غرض یہ کہ وہ رسولؐ جن کے کردار اور صدق بیانی کا اقرار اس منکر و معاند کو بھی ہے وہ (نعوذ باللہ) اختراع و افترا میں انتہائی بے باک تھے۔

[۲] اور چونکہ اس سے انسانی تمدن کو کوئی فائدہ نہیں اسلئے آخرت کا وجود ہی غلط۔ گویا کسی حقیقت کا نفس موجود بھی کسی خود ساختہ مصلحت کے تابع رہتا ہے۔

[۳] اس لئے اگر آپ کے عزیز کو کوئی قتل کر ڈالے تو آپ مجرم کو سزا ہرگز نہ دلوائیے گا کیونکہ عمل قتل تو ہو چکا اس سے باز رکھنے کی اب کوئی صورت ہی نہیں۔ لہذا سزا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

[۴] لیکن اس سچے کا اتنا بھی حافظہ نہیں کہ ابھی ادھر بار بار کیا کہہ آیا ہے۔ خود ہی کہتا چلا آیا ہے کہ رسولؐ نے آخرت اور جزا، سزا، دوزخ و جنت، حور و قصور کے عقائد فلاں فلاں مصلحت سے قرآن میں داخل کئے اور اب کہنے لگا کہ قرآن میں یہ عقیدہ بھی سرے سے نہیں۔

[۵] اور چونکہ یہ "زمین" اور یہ "آسمان" نہ ہوں گے اس لئے کہ اس عالم میں سرے سے کوئی زمین و آسمان ہو گا نہیں۔ ایسا زبردست منطقی دنیا میں آج تک کہیں کیوں پیدا ہوا ہو گا۔

[۶] اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ آگ اگر دلوں سے تعلق رکھتی ہے تو اس کا وجود خارج میں ہو نہیں سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ٹھنڈک اور گرمی اندر بھی ہوں اور باہر بھی۔

جس میں جنت کے لئے یہ الفاظ ہیں کہ کوئی اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ اچھے کام کرنے والوں کی جزا کس کس طرح سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد دل و دماغ و روح کا سکون ہے[2]۔ سورۂ محمد میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، پرہیزگاروں کیلئے جو وعدہ کیا گیا ہے ان کے لئے جنت میں دودھ، شراب اور شہد کی نہریں ہونگی سو یہ سب تمثیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ تو ہیں وہ خیالات جو خدا، رسول، قرآن وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آیئے اب مذہب اسلام کے بارے میں مختصر کچھ کہوں۔ مجھے مذہب اسلام کے اصول پسند ہیں لیکن ان اصول پر چلنے کے لئے جو راہ متعین ہے وہ ناپسند۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے نماز میرے نزدیک ایک ذیلی چیز ہے اور آپ کے نزدیک سب سے اہم۔ نماز پڑھے بغیر بھی آفرینش حیات کے مقصد کو پورا کر رہا ہوں تو آپ کیوں ڈراتے ہیں کہ مجھے مرنے کے بعد ایسا کیا جائیگا ویسا کیا جائیگا۔ ہاں اگر کوئی نماز کے بغیر راہِ راست پر نہیں آسکتا تو اس کو ضرور مصروف نماز رہنا چاہیے۔ لیکن جب کوئی خود بخود راہ راست پر ہے تو کیوں وہ نماز میں وقت ضائع کرے۔[3]

روزے کو لیجئے۔ روزے فرض کرنے کے مختلف وجوہات بیان کئے گئے ہیں[4]۔ فرض کیجئے کہ میں غریب ہوں، روز پیٹ بھر کر کھانے کو مجھے نہیں ملتا۔ بھوک کا احساس مجھے پہلے ہی سے ہے۔ جب پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا تو پھر بدہضمی کی کیا شکایت۔ اب آپ مجھ پر جبر کریں کہ مہینہ بھر روزہ رکھو، کہاں کا انصاف ہے؟ ایک بے چارہ مزدور ہے دن بھر دھوپ میں کام کرتا ہے اور کام کرے تو پیٹ بھرے ورنہ نہیں۔ اب اس غریب کو روزہ رکھنے پر مجبور کیا جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ آپ سے میرا مطلب ہے ملا اور مولویوں سے جن کے پاس کمزور عقیدے کے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے، نذروں اور نیازوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آتی، کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ روزہ واقعی بہت اچھی چیز ہے۔ رکھئے ایک مہینے کے نہیں چھ مہینے کے، لیکن اس کے لئے سب کو کیوں مجبور کرتے ہیں۔ اگر آپ کو یکسانیت کا خیال ہے تو ایسے فرائض کیوں عائد کرتے ہیں جس میں یکسانیت قطعی ممکن نہیں۔ دوسرے اور فرائض —— خیر چھوڑیئے بہت طویل ہوگیا۔ اب رہے مسلمانوں کے اور اعتقادات تو سراسر جھوٹ، لغو، مہمل و بیکار۔[5]

---

[1] اور چونکہ تفصیلات کا احاطہ کوئی نہیں کرسکتا اس لئے انکار نفس وجود ہی سے کر دیا جائے۔ کیسے کیسے خوش دماغی کے موتی اس منطق نے کاغذ کے صفحہ پر بکھیر دیئے ہیں۔

[2] اور دل و دماغ و روح کا سکون بھلا خارجی لذتوں، راحتوں کے ساتھ کیونکر جمع ہوسکتا ہے۔

[3] اور یہ "مقصد آفرینش حیات اور راہ راست" وہی ہیں جن کو آپ کا ذہن عالی گھڑ لے۔

[4] یہ کس نے بیان کئے ہیں؟ —— قرآن تو صرف حکم دیتا ہے اور اپنے حکم کی تعمیل کرانا چاہتا ہے۔ ضمنی اور جزوی مصلحتیں جو کچھ بھی کسی کی ذہانت نے تراش لی ہوں۔

[5] مبارک ہو!! اپنے مضمون کیلئے سجع آپ نے آخر میں خوب تصنیف فرمادیا۔ "سراسر جھوٹ، لغو، مہمل و بیکار"۔

"بیانِ ملحد" آپ دیکھ چکے۔ اس پر عبدالماجد صاحب دریابادی کے تردیدی نوٹ بھی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اب حکیم سندیلوی صاحب کا جواب مسلسل ملاحظہ فرمائیے۔

"جوابِ مسلم"

(حکیم سندیلوی صاحب)

آپ کے بھائی صاحب کی ٹائپ شدہ تحریر کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان کی اس ذہنی کیفیت پر کچھ روشنی ڈالدوں جو اس تحریر کے آئینہ میں نظر آرہی ہے اس طرح ان کے طرزِ فکر اور طریق استدلال کو آسانی سے سمجھا جاسکے گا اور ان سرچشموں کا سراغ لگایا جاسکے گا جہاں سے ان کی فکری موجیں اٹھتی ہیں۔

ان کا انداز تحریر بتا رہا ہے کہ اشتراکی سحر نے ان کے دل و دماغ پر اثر کیا ہے اور غالباً یہ جادو اس وقت کیا گیا ہے جبکہ زندگی کی تلخ کامیوں اور ناکامیوں نے انھیں ماؤف کر رکھا تھا۔ ایسے وقت اشتراک کی سراب بہت زیادہ نظر فریب ہو جاتی ہے اور فریب کے ساتھ امیدوں کے سبز باغ کا جال بھی بچھا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موصوف کا طرزِ فکر نہ تو سائنٹفک ہے نہ فلسفیانہ، بلکہ خالص عامیانہ ہے جس میں کوئی جدت و ندرت بھی نہیں ہے اور وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو عام طور پر اشتراکیت کے عوامی ملحدانہ لٹریچر کا جزو ہیں۔

استدلال کی بنیادی اینٹ ہی خام رکھی گئی ہے علم الانسان اور تاریخ مذہب کے واقف کاروں کی رائے اس طرح نقل کی گئی کہ گویا وہ ایک بالکل بدیہی چیز ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ان علوم کے نظریات و نتائج کی حیثیت بھی محض تخمینی ہے اور ان کے احکام و نظریات خود ان علوم کے ماہرین کے نزدیک بھی قطعی و یقینی نہیں سمجھے جاتے چہ جائیکہ کسی دوسرے کے نزدیک۔

یہ ایک قطعی چیز ہے کہ دنیا پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جس کی تاریخ کا انسان کو کوئی علم نہیں ہے۔ اسی بنا پر اسے زمانۂ ماقبل تاریخ کا لقب دیا گیا ہے۔ زمانۂ مابعد تاریخ کا بھی اکثر حصہ (اور بعض ممالک میں تو اکثر کیا کل حصہ) ایسا گذرا ہے جس کی تاریخ مسلسل و حدانی صورت میں نہیں ملتی۔ ان سب کڑیوں کو ملانے کے لئے ان علوم کے علماء نے قیاسات و اوہامات کی زنجیر تیار کی ہے جو علم و فہم کی دنیا میں مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور سمجھی جاتی ہے۔ ان مدعیان تاریخ دانی و انسان فہمی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ تمہارے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہے کہ خدا کا خیال اسی طرح تدریجاً پیدا ہوا جس طرح تم بیان کرتے ہو؟ اور وہ کونسی منطقی برہان ہے جو تمہارے دعوے کو یقین کے درجے پر پہنچا سکے؟

غور تو فرمائیے کہ ایسے بے دلیل دعوے پر استدلال کی بنیاد رکھنا کہاں تک صحیح و مناسب کہا جاسکتا ہے۔ یہ مزعومات محض بے دلیل ہی ہونے کی کمزوری میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ عقل و نقل کے خلاف بھی ہیں۔ اسلام نے جو انسان اور مذہب کی تاریخ بیان کی ہے

اور جس کی تصدیق دیگر آسمانی مذاہب (عیسویت و یہودیت وغیرہ) بھی کرتے ہیں وہ اس وہمی تاریخ کی کلیتہً تردید کرتی ہے۔ نقل کی مخالفت کے ساتھ عقل کی مخالفت کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ اس مزعومہ تاریخ مذہب کی صحت کا تقاضا یہ تھا کہ جو اقوام عقل و ذہانت، علم و فن کے لحاظ سے جس قدر ترقی یافتہ ہوتیں اسی قدر ان میں خدا کا عقیدہ بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوتا اور برعکس صورت میں حالت بھی برعکس ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بعض اعلیٰ ترقی یافتہ افراد اور جماعتوں (مثلاً ہنود) میں شرک یعنی خدا کا ناقص عقیدہ موجود ہے اور بعض ذہنی اعتبار سے پست جماعتوں اور افراد (مثلاً ہندوستان ہی کے بعض مسلمان قوموں اور جماعتوں) میں عقیدۂ توحید یعنی خدا کا کامل اعتقاد موجود ہے۔ اسی طرح اگر قرآن مجید کا مطالعہ غور و خوض سے کیا جائے تو یہ حقیقت الم نشرح ہو جائے گی کہ آج سے منکرین حق کے جاہل اور وحشی گروہ نے مادہ پرستی اور انکار اللہ کا جو مسلک اختیار کیا تھا بیسویں صدی کا مادہ پرست اور منکر حق فلسفی بھی اس سے ایک انچ آگے نہیں بڑھا ہے۔ طرز تعبیر میں تو ضرور تدریجی ترقی نظر آتی ہے مگر اصل تصور کے لحاظ سے دونوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ کیا اس افسانہ کو کلیتہً خیالی و مہمل قرار دینے کے لئے کافی نہیں ہے جسے خواہ مخواہ علم الانسان اور تاریخ مذاہب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے؟

انھیں سنگریزوں میں جنھیں صاحب تحریر نے سمیٹ کر اپنے فکر کی بنیاد میں بھر دیا ہے صداقت کا ایک جواہر پارہ بھی پایا جاتا ہے مگر تعجب ہے کہ انھوں نے اسی کو نظر انداز کر دیا۔ ذرا وہ سوچیں تو کہ یہ افسانے جنھیں وہ علم الانسان اور تاریخ مذہب کہہ رہے ہیں باوجود اپنی غلطی کے کیا اس حقیقت کی نقاب کشائی نہیں کر رہے ہیں کہ خدا کا اعتقاد انسانی فطرت کا تقاضہ اور اس کی آواز ہے جس کی مخالفت اپنی فطرت سے جنگ کے مرادف ہے؟

مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا (حالی مرحوم)

اس تمہید کے بعد صاحب تحریر نے انکار خدا پر استدلال فرمایا ہے اور اس کے لئے وہی فرسودہ دلیل استعمال کی ہے جو قدیم زمانہ کے ملاحدہ استعمال کرتے رہے ہیں اور آج کی اشتراکی دنیا میں تو وہ سکہ کی طرح رائج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر خدا موجود ہے تو عالم میں شر کیوں موجود ہے۔

یہ دلیل خامیوں کا ایک انبار ہے جن کی جانب سطور ذیل میں اشارہ کرتا ہوں۔

(۱) اتنی بڑی ہستی کو تسلیم کرنے کے بعد جس پر عظمت کی انتہا ہوتی ہے اس سے اس کے کسی فعل کے لئے "کیوں" کا سوال کرنا ایک صریح تناقض ہے۔ علم و تصور سے ماوراء وجود کے افعال کو علم و عقل سے مقید کرنے کی کوشش بالکل خلاف عقل و علم ہے اور اس کی حکمتوں کا احاطہ کرنے کی سعی سمندر کو کوزے میں بھرنے کی سعی سے بھی زیادہ عبث اور خلاف دانش ہے۔

(۲) منطقی اعتبار سے اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے وجود اور دنیا میں "شر" کے وجود میں تناقض ہے۔ لیکن یہ مقدمہ خود محتاج دلیل ہے اور اس پر کوئی دلیل نہ قائم ہے، نہ ہو سکتی ہے۔

(۳) اس دلیل کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے خدا کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی بلکہ "خدائے ناقص" یا "خدائے ظالم" کی نفی لازم

آتی ہے۔ یعنی یہ لازم آتا ہے کہ کسی ایسے خدا کا وجود نہیں ہے جو ظلم کرتا ہو۔ بلاشبہ ایسے خدا کی نفی ہم بھی کرتے ہیں۔ ہم تو اس خدا کے قائل ہیں جو اس قسم کے کل نقائص سے پاک و مبرا ہے۔ یہ کہنا کہ جب خدا ان سب چیزوں کا خالق ہے تو اس سے اس کا ناقص و ظالم ہونا بھی لازم آتا ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے (اور یہی واقعہ بھی ہے) کہ وہ ان سب شرور کو پیدا کرنے کے باوجود شر سے بالکل پاک ہو۔ اور چونکہ اس کی ذات و صفات عقل کی دسترس سے باہر ہیں اس لئے ہم راز کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۳) صفات و افعال کی اچھائی اور برائی موصوف و فاعل کی ذات سے وابستہ اور اس پر موقوف ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی فعل ایک فاعل کے لحاظ سے اچھا ہو اور دوسرے کے لحاظ سے برا۔ انسان کے کسی عضو کو کاٹ ڈالنا اگر اسے اذیت دینے کی غرض سے ہو تو بہت ہی مکروہ فعل سمجھا جاتا ہے لیکن اگر ایک سرجن انسانی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسا کرے تو یہ ایک مستحسن فعل اور اس کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ عالم میں جو ناگوار حوادث ہوتے ہیں اور جو شرور پائے جاتے ہیں ان کا وجود حق تعالیٰ کیلئے معاذ اللہ باعث نقص و عیب ہے جس طرح کہ ہمارے لئے، بالکل مہمل بات ہے جبکہ نہ صرف منسوب الیہ میں فرق عظیم ہے بلکہ نسبت کی نوعیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یعنی ان چیزوں کی نسبت ہماری جانب نسبت اکتساب و ارتکاب ہے اور حق تعالیٰ کی جانب نسبت خلق و پیدائش ہے۔ ہوسکتا ہے (اور یہی ہے) کہ اس نسبت و منسوب الیہ کی خصوصیت کی وجہ سے یہ چیزیں حق تعالیٰ کے لئے مطلق عیب و نقص نہ ہوں۔ جس طرح "تکبر" مخلوق کے لئے عیب و نقص ہے مگر حق تعالیٰ کی ایک صفت کمال ہے۔

بلا تشبیہ سمجھانے کیلئے میں سمندر کی مثال پیش کروں گا۔ روئے زمین کی نجاستیں بہہ بہہ کر اس میں پہنچتی رہتی ہیں لیکن اس سے اس کی طہارت میں کوئی کمی ہونے کے بجائے خود وہ نجاستیں طاہر ہو جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مخلوق پر خالق کو قیاس کرنا بالکل خلاف عقل و قیاس ہے۔

(۵) اس استدلال کی روح خدا کو جاننے کی سعی لاحاصل ہے، جس ہستی کی ذات و صفات انسان جان سکتا ہو اسے خدا کہنا ہی غلط ہے، وہ انسانی ذہن کی ایک مخلوق ہے نہ کہ اس کا خالق۔ ہم خدا کو "مانتے" ہیں "جانتے" نہیں ہیں۔ اور اسی ہستی کو خدا کہتے ہیں جسے "ماننا" ضروری ہے اور جس کا "جاننا" ناممکن ہے۔

زیر بحث دلیل کا ہر حصہ کمزور ہے لیکن ہدایت کے لئے ان پانچ کمزوریوں کا تذکرہ بھی کافی سے زائد ہے۔

یہ عالم اور اس کا ایک ایک ذرہ حق تعالیٰ کے وجود کامل اس کی قدرت و عظمت اور اس کی اعلیٰ حکمت و دانائی کا گواہ ہے۔ اس منظم و پر حکمت نظام کو مادے (Matter) اور قوت (Energy) کی اندھی بہری اور عقل و شعور سے خالی طاقتوں کی طرف منسوب کرنا اسی قدر خلاف عقل و دانش ہے جس قدر کسی خوبصورت و آراستہ عمارت کو معماروں اور انجینیروں کا کارنامہ دینے کے بجائے محض مادے کی غیر شعوری حرکتوں کا نتیجہ قرار دینا انسانی فطرت اس نظام عالم کو دیکھ کر خود بخود قائل ہو جاتی ہے کہ یہ کسی دانا و توانا ذات کی قدرت کا نمونہ ہے نہ کہ عقل و شعور سے مبرا طاقتوں کا نتیجہ۔

صاحب مضمون جدید ترین سائنٹفک تحقیقات سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ اسے دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ علمی مشاہدات و

تجربات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ مادہ خود ایک فانی شے ہے جو آہستہ آہستہ قوت (Energy) میں تحلیل ہو جاتا ہے اور قوت ناقابل دسترس (Unavailable) ہو جاتی ہے جو درحقیقت اس کی فنا کے مرادف ہے۔ اسی طرح سائنس کے تجربات و دلائل نے یہ بات بھی ثابت کر دی ہے کہ مادہ ازلی شے نہیں ہے بلکہ عدم سے وجود میں آیا ہے۔ ایٹم بم کی دریافت کے بعد نظریہ سالمات کے ٹکڑے اڑ چکے ہیں جو اس مادہ پرستی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تو مادہ کا وجود ہی ثابت کرنا ناممکن ہے چہ جائیکہ سارے عالم کے وجود کو اس کا رہین منت قرار دیا جائے۔ مادہ پرستی اختیار کرنے سے پہلے ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ عالم میں کوئی ایسی چیز بھی موجود ہے جس پر مادہ (Matter) کے لفظ کا اطلاق کیا جاسکے۔

علمی ترقیوں نے جس طرح مادے کو ایک مہمل نقطہ بنا دیا ہے اسی طرح قوانین فطرت (Laws of nature) (جن کا سہارا صاحب مضمون نے لیا ہے) کا مسئلہ بھی افسانۂ کہن بن چکا ہے۔ یہ ایک صدی پیشتر کی باتیں ہیں جنہیں وہ بیسویں صدی میں دہرا رہے ہیں جبکہ آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا یہ تسلیم کرنے کو کسی طرح تیار نہیں ہے کہ حوادث عالم کچھ ایسے فطری قوانین کے پابند ہیں جن میں تغیر ناممکن ہے۔ حوادث عالم کے درمیان علت و معلول کا تعلق اس خیالی عالم آرائی اور مذہب مادیت کی جان ہے مگر یہ تعلق خود محتاج ثبوت ہے اور علمی دنیا اس کے ثبوت سے ابھی تہی ہے۔ آگ کپڑے کو جلاتی ہے یہ ایک مشاہدہ ہے اور یقینی چیز ہے لیکن اس کی کیا دلیل ہے کہ آگ کپڑا جلنے کی علت ہے؟ ہم بار بار کے تجربات سے یہ تو یقین کر سکتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر دنیا کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ جدید و قدیم محققین کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی ہے جو اس کا قائل ہے کہ حوادث عالم کے درمیان علت و معلول کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ جن چیزوں کو غلطی سے علل کہا جاتا ہے وہ صرف علامات ہیں جس طرح ریلوے گارڈ کا سبز جھنڈی دکھانا ٹرین چلنے کی علت نہیں بلکہ علامت ہے۔ انسان اپنی سادہ لوحی اور ناواقفیت کی وجہ سے دو چیزوں کو بار بار پے در پے اور ایک کو مقدم دوسری کو موخر دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اول علت اور دوسری معلول ہے حالانکہ اس دعوے پر کوئی دلیل اب تک قائم نہیں ہو سکی ہے۔

بیشک جس طرح کا نظام ایک ذی علم و ارادہ ناظم کے وجود کی نشانی ہے اسی طرح کائنات کا نفس وجود بھی حق تعالیٰ کے وجود کی علامت و دلیل ہے۔ مادہ اور توانائی کے متعلق یہ سوال کہ یہ کس طرح وجود میں آگئے بالکل فطری سوال ہے۔ لیکن خدا کے متعلق یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ صاحب مضمون اگر غور کریں تو ان کے اس اعتراض "جس طرح یہ کائنات خود بخود نہیں پیدا ہو سکتی اس کا خالق خود بخود کیسے پیدا ہو سکتا ہے"؟ اسی میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کائنات کے متعلق انسانی ذہن میں یہ سوال پیدا ہی کیوں ہوتا ہے؟ انسان کی اس ذہنی بے چینی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اس کائنات (جسے مادہ اور توانائی کا مجموعہ کہا جاتا ہے) میں اس قسم کے یقینی علامات دیکھتا ہے جو اس چیز کی قطعی دلیل ہیں کہ یہ کائنات "عدم" سے "وجود" میں آئی ہے۔ اور "نہیں" سے "ہے" بنی ہے۔ اس لئے اس کیلئے کوئی ایسا خالق کامل ہونا ضروری ہے جو اس نقص و عیب سے پاک ہو اور جس پر "نہیں" کا کبھی اور کسی طرح

اطلاق نہ ہو سکتا ہو۔ جب تک ایسی ہستی کے وجود کو انسان تسلیم نہ کرے اس فطری سوال کا ختم ہونا ناممکن ہے اور فطرت انسانی کا چین حاصل کرنا محال ہے۔ تسکین تو ایک ایسی ہی ہستی کے ماننے سے ہو سکتی ہے جو وجود محض اور ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے موجود ہو اور جس میں عدم و نقص کا شائبہ بھی نہ ہو، اس کے متعلق سرے سے یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ کیسے موجود ہو گیا؟ یہ سوال تو اسی موجود تک محدود ہے جس پر "موجود ہو گیا" اور "وجود میں آ گیا" کا اطلاق کیا جا سکے جو خود ہستی و وجود کا سرچشمہ ہو، اس کے متعلق یہ سوال کیسا؟ ایسی ہستی کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے اوصاف کا انکار جو اسلام نے اس کے لئے بیان کئے ہیں صریح تناقض ہو گا جو خدا کو مانے گا اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ علیم بھی ہے ذی ارادہ بھی ہے اور قدیر بھی۔ اسی طرح وہ کل صفاتِ الٰہی جو قرآن مجید و احادیث نبویہ میں بیان کئے گئے ہیں ان سب کا اقرار کرنا پڑے گا۔

وجہ یہ ہے کہ صفات نام ہے وجود کی مختلف حیثیتوں کا۔ جو شخص حق تعالیٰ کی کسی صفت کا انکار کرتا ہے وہ گویا اسی حیثیت سے اس کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ مخلوق میں تو یہ ممکن ہے کہ ہم کسی موجود کی شخصیت کا اقرار کرنے کے باوجود اس کے بعض صفات کا انکار کر دیں اس لئے کہ کسی مخلوق کا وجود کامل نہیں ہے بلکہ ناقص ہے یعنی مخلوق بعض حیثیات سے موجود ہیں اور بعض حیثیات سے معدوم ہیں۔ لیکن خالق کائنات کو ہم نے وجود حقیقی و کامل مانا ہے بلکہ نفس وجود کا سرچشمہ اسی کو ماننا پڑتا ہے اس لئے اس میں عدم کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص خدا کے ارادہ کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا موجود ہے مگر ذی ارادہ نہیں ہے تو اس کے لئے صرف دو راستے ہی ہیں۔ یا تو وہ یہ کہے کہ عالم میں "ارادہ" کے نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور یہ لفظ مہمل ہے اور یا اس کا قائل ہو کہ ایک ذی ارادہ ہستی کی حیثیت سے خدا کا وجود نہیں ہے۔ گویا معاذ اللہ اس کا وجود ناقص ہے۔ حالانکہ یہ چیز ایک تسلیم شدہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ میں اس بات کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ اگر انسان نے حوادث عالم کے (زعم خود) ظاہری اسباب کو دریافت کر لیا ہے تو اس سے خدا کے وجود کی نفی کس طرح لازم آتی ہے۔ اگر سمندر کے بخارات ابر بن جاتے ہیں اور ابر آبِ باراں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یا بیج تدریجاً ایک درخت کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو جائے گا کہ یہ سب خود بخود ہوتا ہے اور کسی خدا کا (معاذ اللہ) وجود نہیں ہے؟ ہم ان ظاہری اسباب کے وجود کی کب نفی کرتے ہیں؟ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر ان میں سے ہر حادثہ کے متعلق (خواہ وہ سبب ہو یا مسبب) یہ سوال بدستور باقی رہتا ہے کہ وہ عدم سے وجود میں کس طرح آ گیا؟ اس کا شافی جواب بجز اس کے کوئی نہیں کہ یہ سب ایک عالم و قدیر کامل ہستی کی قدرت و ارادے کا کرشمہ اور اس کی حکمت و عظمت کی دلیل ہے۔ حیرت انگشت بدندان ہے کہ وجود حق کے فطری دلائل کو اس کی نفی کے لئے استعمال کرنے کی زیادتی کس بے باکی کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ آثار تو وہ واضح نشانیاں ہیں جنہیں دیکھ کر قائل ہونا پڑتا ہے کہ

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقیست دفترے معرفتِ کردگار (سعدیؒ)

اسلام نے حق تعالیٰ کے متعلق جو تصورات پیش کئے ہیں ان سے کامل ناواقفیت کی وجہ سے صاحب مضمون تحریر فرماتے

ہیں کہ "یہ سب جھوٹ ہے کہ عرش پر اعلیٰ نظام کا سنبھالنے والا بیٹھا ہے"۔ اسلام کب کہتا ہے کہ معاذ اللہ رب قدیر عرش پر بیٹھا ہوا ہے؟ جس طرح کائنات کا وجود اور اس کا نظام حق تعالیٰ کے وجود و عظمت کی واضح دلیلیں ہیں اسی طرح اور بھی سینکڑوں دلائل ہیں جو اس ذات عظیم الشان کے وجود کی گواہی دے رہی ہیں۔ ان سب کی تفصیل میں تو بہت طوالت ہے اس وقت صرف ایک چیز پیش کرتا ہوں جس پر غور کرنے سے ایک منصف مزاج کے لئے یہ مسئلہ بالکل بدیہی ہو جاتا ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن کسی معدوم کی جانب متوجہ ہونے سے بالکل عاجز و قاصر ہے۔ جب ہمارا ذہن کسی رشتہ کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ اس امر کی یقینی اور قطعی علامت ہے کہ اس رشتہ کا وجود ہے۔ آپ لاکھ بار کوشش کیجئے کہ کسی معدوم محض کا تصور کر سکیں مگر آپ ایک بار بھی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کہ "خدا کا وجود ہے" خود اپنی دلیل ہے اگر معاذ اللہ اس کا وجود نہیں ہے تو ہمارا ذہن ادھر متوجہ کیسے ہوا؟ اور اس میں یہ تصور کس طرح پیدا ہوا؟ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ "خدا کا وجود نہیں ہے" تو وہ درحقیقت اس کے وجود کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ انکار کا انضمام کر کے کلام میں تناقض پیدا کرتا ہے۔ اگر خدا کا وجود نہیں ہے تو اس کا ذہن ادھر کس طرح متوجہ ہوا۔ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ "موجود کا وجود نہیں ہے" اور اس کی لغویت ظاہر ہے۔ بقول مولانا رومیؒ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب گر دلیلش خواہی از وے رو متاب

اللہ تعالیٰ کا وجود خود اپنی آپ دلیل ہے۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے اس کی صفات میں سے "النور" اور "الظاہر" بھی ہیں۔ وفی انفسکم افلا تبصرون۔

اس دلیل پر ظاہر ہیں اور حقیقت ناشناس نظروں میں ایک شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس طرح تو دیویوں اور دیوتاؤں وغیرہ کا وجود بھی ثابت کیا جا سکتا ہے جواب یہ ہے کہ ان کے نقش وجود کا انکار کس کو ہے۔ انکار تو ان کے معبود ہونے سے ہے۔ مثلاً ہم اس کے تو منکر نہیں ہیں کہ "ہبل" نام کا کوئی بت یا انسان یا جانور وغیرہ عالم میں موجود ہی نہیں تھا۔ ہمارا کہنا تو یہی ہے کہ اس دلیل موجود کی جانب "معبودیت" کی نسبت کرنا غلط ہے۔ "معبودیت" کی صفت تو صرف اس ذات میں پائی جاتی ہے جو ہر طرح کامل کل کمالات کی جامع کل نقائص سے پاک، اس عالم مخلوقات سے ماورا ہے۔ چونکہ ہمارے ذہن میں یہ تصور ہی داخل نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ دنیا کی اغلب اکثریت کے ذہنوں میں یہ تصور ہزاروں برس سے موجود ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اسلام سے اسقدر شدید ناواقفیت کے باوجود صاحب مضمون نے اس قدر جرأت کیسے کی کہ رسالت، آخرت، عبادت اور وحی کے ایسے اہم و نازک مسائل پر رائے زنی کرنے لگے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اقرار صاحب مضمون کو بھی ہے۔ ان کے کردار کی بلندی، ان کی صداقت و حکمت میں شک کرنے کی انھیں بھی جرأت نہیں ہو سکی۔ مگر اس اقرار کے ساتھ یہ کہنا کہ انھوں نے خدا کے اور آخرت کے متعلق کل باتیں معاذ اللہ غلط کہیں ایک عجیب و غریب تضاد ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہ امور جو ہمارے حواس اور ہماری عقل کی دسترس سے قطعاً باہر ہیں ان کے متعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ دنیا کے لاکھوں دوسرے انسان (انبیاء و مرسلین) جن کی صداقت، دانائی، دیانت،

بلند اخلاق و کردار کا سکہ ان کے بڑے سے بڑے دشمنوں کے دلوں پر بھی بیٹھا ہوا ہے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں۔ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ان کی باتوں کو جھٹلا دیں اور ان امور کا انکار کریں جو ہماری عقل کی دسترس سے قطعاً باہر ہیں؟ جو چیز سرے سے ہماری عقل کے دائرہ حکومت ہی سے خارج ہے اس کی نفی کرنے کا اسے کیا حق ہے؟ اور اس کی نفی کرنے کی وہ کب مجاز ہے؟ عقل اسی چیز کی نفی کر سکتی ہے جسے وہ ثابت بھی کر سکے۔ مگر جو چیز اس کی رسائی سے بالاتر ہو اس کی نہ وہ نفی کر سکتی ہے نہ اسے ثابت کر سکتی ہے۔ ایسے امور میں فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے کہ وہ معتمد مخبر پر اعتماد کرے اور اس کی بات کو مان لے۔ یہی وہ فطری راستہ ہے جو ہم روزمرہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی اگر دنیا کی سیر نہیں کی ہے تو ہم جغرافیہ دانوں کے بیان پر یقین کرتے ہیں۔ اگر ہم طبعیات نہیں جانتے ہیں تو اس کے ماہرین کی بات مانتے ہیں۔ اگر ہم طبیب نہیں ہیں تو ہم طبیب کی بات پر اس درجہ یقین کرتے ہیں کہ اپنی جان اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اسی فطری طریقہ سے آخرت، جنت، دوزخ، قیامت، وحی، ملائکہ وغیرہ کے بارے میں انبیاء و مرسلین کی متفقہ بات پر یقین نہ کریں؟ خود صاحب مضمون نے علماء طبیعیات و تاریخ وغیرہ کے اقوال پر کیوں یقین کر لیا حالانکہ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں اور غلطیوں کا امکان بھی بہت قوی ہے۔

انبیاء کی تصدیق فطرت کا تقاضا ہے اور اس کے خلاف کرنا اپنی فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ ان امور کے بیان کو محض تمثیلات یا شاعرانہ تخیلات پر محمول کرنا بالکل بے دلیل دعویٰ ہے۔ اگر اس قدر تصریحات و تکرار کے بعد بھی کسی کا قول تمثیل و تشبیہ پر محمول کیا جا سکتا ہے تو کسی شخص کے کلام کو سمجھنا ہی ناممکن ہے۔ اس طرح تو دنیا کے کل مولفین و مصنفین کی عرقریزیوں کو خاک میں ملایا جا سکتا ہے۔ تاریخ جغرافیہ وغیرہ کے واقعات و مسائل کا صاف انکار کیا جا سکتا ہے بلکہ روزمرہ کے معاملات میں اہم دستاویزات کا انکار کیا جا سکتا ہے۔

عبادت کے مفہوم میں بھی صاحب مضمون ایک عجیب مغالطہ میں مبتلا ہوئے ہیں۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان پر خدا کو قیاس کر لیا۔ ہماری طرح اللہ تعالیٰ کی رضامندی خود اپنے نفع کی بنا پر نہیں ہوتی۔ اس کی رضامندی کے معنی یہ ہیں کہ فلاں کام اس کے نزدیک پسندیدہ ہے اور ناراضی کا معاملہ اس کے برعکس ہے اس کو نہ کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ ضرر۔ عبادت سے نفع انسان ہی کا ہوتا ہے مگر اس کا طریقہ یہی ہے کہ جب وہ حق تعالیٰ کا ایک پسندیدہ فعل انجام دیتا ہے تو حق تعالیٰ اسے انعامات سے سرفراز فرماتے ہیں۔

انسانی اعمال و اخلاق کی یہی قدر (Value) ہے جو اسلام مقرر کرتا ہے۔ اگرچہ اسلامی عبادات سے اس دنیا کے منافع مثلاً نظام زندگی کی درستی، راحت و آسائش اور اجتماعی فوائد کی بہتات بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن اسلام انھیں مقصود بالذات نہیں قرار دیتا ہے اسلئے کہ وہ انسانیت کو ان حقیر اقدار سے بلند تر سمجھتا ہے۔

صاحب مضمون نے جن اسلامی مسائل (مثلاً وحی، معجزات رسالت وغیرہ) پر بحث کی ہے ان پر ان کے خیالات کی تردید کرنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ اس ساری بحث میں انھوں نے صرف دعوے پیش کئے ہیں اور دلیل کسی ایک پر بھی نہیں قائم کی ہے۔ تاہم میں نے ان مسائل کے متعلق بھی سطور بالا میں ایک ہلکا تبصرہ کر دیا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ صاحب مضمون کس قدر سطحی باتوں میں الجھے ہوئے ہیں اور جو شبہات انھیں لاحق ہو گئے ہیں وہ کس قدر کمزور اور بے جان ہیں۔

ضروری باتیں لکھ چکا تھا اس لئے مکتوب یہیں ختم کر دینا چاہا تھا مگر خیال آیا کہ دو سطریں آخرت و قرآن مجید کے متعلق بھی لکھ دوں اس کتاب الٰہی کے منزل من اللہ ہونے کے متعلق جو شبہ موصوف کو لائق ہوا ہے وہ بھی ارتقاء عقل اور اس کے طریق کار سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ عقل انسانی اور اس کا خصوصی عمل یعنی فکر دیگر مخلوقات کی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور فکر نتائج فکر کی حقیقی علت نہیں ہے بلکہ ان کی علامت ہے جس طرح نکاح اولاد ہونے کی حقیقی علت نہیں ہے۔ یا زراعت غلہ پیدا ہو جانے کی حقیقی علت نہیں ہے اس لئے عقل کو جس قدر حق تعالیٰ کے ساتھ قریبی تعلق ہوگا اسی قدر وہ زیادہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ کہی جائے گی۔ انبیاء مرسلین کی عقل و فہم کو یہ درجہ عطا کیا جاتا ہے کہ وہ بلاواسطہ فکر حق تعالیٰ جل شانہ سے علوم کو حاصل کر سکے۔ یہ عقل کا ارتقاء ہوا یا اس کی پستی ہوئی ؟ اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد اس قسم کے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

جنت و دوزخ، جزاء و سزا کے متعلق بھی یہ کہنا کہ ان تصورات سے انسان کو اجتماعی حیثیت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور جب تدارک کا موقع ہی نہ رہے تو سزا سے فائدہ ؟ دراصل انسان پر خدا کو قیاس کرنے کا نتیجہ ہے جو یقیناً ایک غلط قیاس ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو وہی عرض کرنی ہے جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حق تعالیٰ کے کسی فعل کے متعلق کیوں کا سوال کرنے کا کوئی حق کسی شخص کو نہیں پہنچتا اور حق تعالیٰ کو اپنی عقل و فہم اور اس کی سوچی ہوئی "ضرورت" کا پابند بنانا تو عجیب جرأت ہے جس کے جواز کے لئے کوئی عقلی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ آخرت کی جزاء و سزا کا راز اعمال و افعال کی خاصیتوں میں پنہاں ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مختلف اشیاء میں مختلف خاصیتیں پیدا کی ہیں اسی طرح انسان کے مختلف اعمال و افعال میں بھی مختلف خاصیتیں پیدا کی ہیں۔ بعض اعمال انسانی روح کو ایک ایسے عالم کی طرف لیجاتے ہیں جسے جنت کہتے ہیں اور بعض اسے عالم جہنم تک پہنچاتے ہیں ان دونوں جہانوں کی فضاؤں میں بالکل تضاد ہے۔

ایک میں راحت ہی راحت ہے، دوسرے میں کلفت ہی کلفت۔ ایک انسانی مزاج کے بالکل موافق ہے اور دوسرا بالکل مخالف فی نفسہ اپنی اپنی جگہ پر دونوں کا وجود مناسب اور مبنی بر حکمت ہے۔ یہ انسان کی غلطی ہے کہ وہ ایسی راہ اختیار کرتا ہے جو اسے ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جو اس کے مزاج کے بالکل مخالف ہے اس سے اس عالم کے پیدا کرنے اور پیدا کرنے والے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اس عالم دنیا میں بھی ہر قسم کی چیزیں موجود ہیں زہر بھی ہے تریاق بھی، آگ بھی ہے پانی بھی۔ گرمی بھی سردی بھی۔ پھول بھی کانٹے بھی۔ ان سب کی پیدائش پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا تو کسی دوسرے عالم کی پیدائش پر کس طرح اعتراض ہو سکتا ہے۔

اسی استدلال کی بنیادی غلطی صاحب تحریر کا ایک بنیادی نظریہ ہے جو غیر شعوری طور پر ان کے ذہن پر غالب ہو گیا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی واقعہ کا واقعہ ہونا اس چیز پر موقوف ہے کہ اس کی کوئی ضرورت ہماری سمجھ میں آجائے۔ گویا اگر کسی واقعہ کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہمیں اس کا انکار کر دینے کا حق ہے۔ اور وہ واقعہ ہی واقعہ نہیں باقی رہ سکتا۔ اس خیال کی غلطی اس قدر واضح ہے کہ جس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ بات بالکل صاف ہے کہ واقعہ بہر حال واقعہ ہے اس کا وجود

ہماری "ضرورت فہمی" پر موقوف نہیں ہو سکتا۔ اس طرزِ استدلال کو اگر صحیح سمجھ لیا جائے تو دنیا کے بہت سے بدیہی واقعات کا انکار جائز ہو جائے گا۔ مثلاً ایک تندرست آدمی کو بیمار پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے وہ بیمار نہیں ہے خواہ ہم دیکھ رہے ہوں کہ اس کا بدن شدت بخار سے بھنا جا رہا ہو۔ "زید جوان آدمی تھا اس کے مرنے کی کوئی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لئے اگرچہ وہ دفن ہو چکا ہے مگر مرا نہیں ہے"۔

جس استدلال سے اس قسم کے مہمل نتائج نکلیں اس کی صحت کا دعویٰ کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرت کا وجود اور اس کے احوال، واقعات نہیں، ان کی ضرورت ہماری فہم میں آئے یا نہ آئے وہ بہرحال واقعات رہیں گے اور محض اس کمزور بنیاد پر ان کا انکار کسی طرح جائز و صحیح نہیں ہو سکتا۔

طلوعِ اسلام | "ملحد" کے شکوک و اعتراضات آپ نے دیکھ لئے اور اسے بھی دیکھ لیا کہ "دو خدا پرستوں" نے ان شکوک کے جوابات کیا ارشاد فرمائے ہیں۔ اعتراضات، وقیع نہیں، سطحی ہیں۔ اور اسی انداز کے جو عام طور پر کالج کے طالب علموں کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ

(i) اعتراضات کا ایک حصہ (مثلاً اثبات وجود خداوندی) ایسا ہے جسے سائنس کی تحقیقات کے پیش نظر وارد کیا گیا ہے۔ اس باب میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ خود سائنس کی تحقیقات کے متعلق معترض کا علم (up to date) نہیں ہے۔ اگر وہ سائنس کے انکشافات و نظریات (اور فلسفۂ جدیدہ) کے ساتھ ساتھ چلتے، تو ان کے بہت سے شکوک کا جواب، خود علمائے سائنس اور فلسفہ کے ہاں سے مل جاتا۔

(ii) اعتراضات کا دوسرا (اور بڑا حصہ) اس تصور پر مبنی ہے جو "مذہب" نے پیدا کر رکھا ہے۔ اگر معترض کو معلوم ہوتا کہ قرآن کی طرف سے دیا ہوا "دین" اس مذہب سے مختلف ہے جو مسلمانوں میں عام طور پر رائج ہے تو ان کے بہت سے شبہات کا ازالہ از خود ہو جاتا۔

(iii) اسی طرح رسالت کے متعلق اعتراضات بالعموم نبی اکرمؐ کی اس سیرت سے متعلق ہیں جو روایات کی رُو سے مرتب کی جاتی ہے۔ اس سیرت سے متعلق نہیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ اسی طرح وحی کی صحیح ماہیت نہ سمجھنے میں معترض کے نقصِ علم کا قصور ہے اسے بھی قرآن اور خود علمائے مغرب کے اعتراضات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ قارئین طلوع اسلام نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اگر معترض، طلوع اسلام کا مسلسل مطالعہ کرتے (یا معارف القرآن کی مجلدات ان کی نگاہوں سے گذری ہوتیں) تو ان کا سینہ اس قسم کے اعتراضات کی آماجگاہ نہ بنتا۔ ہم ان اعتراضات کا جواب نہیں لکھنا چاہتے کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ قارئینِ طلوع اسلام بالعموم اس قسم کے اعتراضات کی حد سے بہت آگے نکل چکے ہیں، اور ان کے سامنے اب اور قسم کے مسائل ہیں۔ اگر معترض صاحب ہم سے کہیں قریب ہوتے تو ہم ان کے اطمینان قلب کی کوشش ضرور

کرتے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح ان کے اعتراضات کا ازالہ ہوجاتا اور وہ قرآن کے پیش فرمودہ دین کی حقانیت کے قائل ہوجاتے جس کا خطاب انسانی بصیرت سے ہے۔

ہم نے جس مقصد کے لئے اس طویل سلسلہ کو نقل کیا ہے اسے آغازِ کلام میں بتا چکے ہیں۔ ہماری قوم کے نوجوانوں کا بیشتر حصہ اسی قسم کے شکوک میں الجھا ہوا ہے (جس کی وجہ ان کی ناقص تعلیم اور مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کردہ مذہب ہے) یہ اعتراضات "مذہب" کے ان تصورات کے پیدا کردہ ہیں جو عجمی اثرات سے "اسلام" کا نام اختیار کر چکے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری درسگاہوں (اسکولوں اور کالجوں) میں قرآن کی صحیح تعلیم رائج کی جائے جو ہمارے نوجوانوں کے سامنے اس دین کا ٹھیک ٹھیک تصور پیش کرے جس سے ان کی نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا اور قلوب میں یقین کی روشنی پیدا ہو۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو رفتہ رفتہ قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ، ملا کے پیش کردہ مذہب کی توہم پرستیوں کی وجہ سے اسلام ہی سے برگشتہ ہوجائے گا۔ ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا۔

ہندوستان میں طلوعِ اسلام

کی سول ایجنسی

ہاشمی نیوز ایجنسی، نعل صاحب روڈ۔ ناگپور

کے پاس ہے

ہندوستان کے قائمین انہی سے پرچہ طلب کریں۔

طلوعِ اسلام کا مستقبل

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ طلوع اسلام کی اشاعت کے ملتوی کر دینے کی خبر کے بعد قارئین طلوع اسلام کی طرف سے مکتوبات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان خطوط میں جو تجاویز پیش کی گئیں وہ تو کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہ تھیں لیکن ان خطوط سے جن جذبات کا اظہار ہوتا تھا، اس سے یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ ان حضرات کے نزدیک طلوع اسلام محض ایک ماہوار پرچہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا نقیب ہے اور اس کے پڑھنے والے اپنے آپ کو اس تحریک کے رکن تصور کرتے ہیں۔ یہ تحریک ہے قرآنی نظامِ ربوبیت کا دوبارہ قیام۔

گذشتہ اشاعت کے بعد ان خطوط کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور قارئین کے تقاضے اور بھی شدت اختیار کر گئے۔ اس نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم اپنے سابقہ فیصلے پر نظرِ ثانی کریں۔

ان تجاویز میں ایک تجویز یہ تھی کہ اس کے خسارے کو عطیات سے پورا کر دیا جائے۔ اس کے متعلق ہم گذشتہ اشاعت میں عرض کر چکے ہیں کہ یہ تجویز ہمارے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطیات یا اس قسم کے اور خیراتی چندے محض کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں کسی تحریک کے مستقل قیام کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

اس کے علاوہ اور تجاویز اسی قسم کی تھیں کہ طلوع اسلام کے خریدار پیدا کرنے میں کوشش کی جائے یا اس کی قیمت بڑھائی جائے۔ ان تجاویز سے شاید کسی حد تک بار ہلکا ہو سکے لیکن اس قسم کی چیزوں پر کامل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

قارئین طلوع اسلام میں سے جن احباب کے تقاضے زیادہ شدید ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو خالی جیب اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ہیں کہ

دلے آوردہ ام دیگر ازیں کا فرچہ می خواہی

ہر چند بازارِ بیع و شری میں جہاں پیسے کا کام صرف پیسے ہی سے چل سکتا ہے، دلوں کی پیشکش بازارِ مصر کی بڑھیا کی سوت کی انٹی سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی لیکن ہماری نگاہوں میں یہ پیش کش اتنی گراں بہا ہے کہ ہم اسے ٹھکرانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔ تحریک ربوبیت کے اولین مخاطب یہی لوگ ہیں اور جب یہ لوگ طلوع اسلام کو اپنی تحریک کا آرگن سمجھتے ہیں تو طلوع اسلام کو محض ان کی آرزوؤں کے آسرے جاری رہنا ہی ہوگا۔

لہٰذا ہم نے بلا مزید غور و خوض کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ طلوع اسلام کو اس خسارے کے باوجود جاری رکھا جائیگا۔ بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا۔

اس ضمن میں جن مخلص حضرات نے طلوع اسلام کے خریدار بڑھانے کے وعدے کئے ہیں وہ اگر اپنے طور پر ان وعدوں کو پورا کریں گے تو ہمارے لئے یہ امر بہر حال شکریہ کا موجب ہوگا۔ اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں گے تو ہمیں ان پر کوئی گلہ نہیں۔

لیکن یہیں سے ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ طلوع اسلام کو ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ رکھنا اور آگے بڑھانا مقصود ہے تو اس کیلئے کسی مستقل انتظام کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ہم نے اس مسئلے پر بہت غور کیا ہے اور ہم سمجھتے کہ اس کی سب سے بہتر صورت وہی ہے جو سال گذشتہ المیزان لمیٹڈ کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ اس لمیٹڈ کمپنی کا خیال ہی اس ضرورت کے ماتحت پیدا ہوا تھا کہ قرآنی لٹریچر کی نشر و اشاعت کیلئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو کاروباری طریق پر لمیٹڈ شکل میں کام کرے۔ اس کمپنی نے اپنا کام اس لئے شروع نہیں کیا کہ جس قدر سرمائے سے آغاز کار کا خیال تھا اتنا سرمایہ جمع نہیں ہو سکا۔ اب جبکہ طلوع اسلام خود ایک تحریک کی شکل حاصل کر رہا ہے، ہم اسی سکیم کو دوبارہ سامنے لاتے ہیں۔ المیزان کے ایک حصے کی قیمت ۱۰۰/- روپے ہے۔ کمپنی باقاعدہ رجسٹر ہو چکی ہے۔ اور اس کے قواعد و ضوابط چھپ کر تیار ہیں۔

جو حضرات اس قرآنی تحریک کے جاری رکھنے کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں جس کا نقیب طلوع اسلام ہے، ان کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ المیزان کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ اس کیلئے آپ ہمیں یہ لکھئے کہ

آپ المیزان کے کتنے حصے خود خرید سکتے ہیں یا فروخت کر سکتے ہیں۔

ہمارے پاس یہ اطلاع دسمبر کے مہینے میں آجانی چاہئے۔ آپ جو کچھ لکھیں پختہ طور پر لکھیں، کیونکہ آپ کے اسی وعدے پر ہم اس قرآنی تحریک کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر المیزان کی اسکیم کو آپ نے کامیاب بنا دیا تو نہ صرف یہ کہ آپ اور ہم طلوع اسلام کی طرف سے ہی بے فکر ہو جائیں گے بلکہ قرآنی نظام کی تحریک و اشاعت کے سلسلہ میں جو تجاویز ہمارے پیش نظر ہیں، وہ بھی عملی شکل میں سامنے آجائینگی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم اس طرح قرآنی نظام کے دوبارہ احیاء کیلئے ایک قابل اعتماد صورت پیدا کر سکیں گے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

ادارہ طلوع اسلام

باب المراسلات

(پروین)

نظامِ صلوٰۃ اور نماز

لاہور سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:۔

آپ نے نظامِ صلوٰۃ کے متعلق جستہ جستہ جو کچھ آجتک لکھا ہے میں اس کا بغائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ نے دین کے ایک اہم اور بنیادی گوشے پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ایک بات ہنوز وضاحت طلب ہے اور وہ یہ کہ اس نظامِ صلوٰۃ میں اس صلوٰۃ کا کیا مقام ہوگا جسے مؤقت فریضہ کہا گیا ہے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ آپ کا موعودہ مضمون "قیامِ صلوٰۃ" شائع ہو جائے تو اس میں شاید اس مسئلہ کا حل مل جائے۔ لیکن چونکہ وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا اور طلوعِ اسلام کے متعلق یہ خبرِ بد سننے میں آرہی ہے کہ اس کی اشاعت ملتوی کر دی جائیگی (خدا کرے یہ خبر محض افواہ بن کر رہ جائے) اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ آپ سے خاص طور پر اس سوال کے متعلق دریافت کر لوں۔

اگر جرأت عرض معاف ہو تو کیا میں یہ بھی دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟

جواب

اگر آپ میری تحریروں کا مسلسل اور بالاستیعاب مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ جہانتک میں قرآن کو سمجھ سکا ہوں، قیام الصلوٰۃ، قرآن کی ایک نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح ہے جس سے درحقیقت مقصود اس معاشرے کا قیام ہے جس میں قانونِ خداوندی عملاً نافذ ہو اور اس طرح ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے تاکہ وہ اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی کی سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوتا ہوا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے۔ لہٰذا نظام الصلوٰۃ، ایک مردِ مومن (یا جماعتِ مومنین) کی پوری کی پوری زندگی کو محیط ہوگا۔ ان کا ایک ایک سانس اس حقیقتِ کبریٰ کا شاہد ہوگا کہ وہ مصلّی (یعنی خدا کے پیچھے پیچھے جانے والے کارواں کے افراد) ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک شعبہ، عبادت (یعنی قانونِ خداوندی کی محکومیت) کا مظہر ہوگا۔ ان کے کاروبارِ حیات کا فلم سامنے آجائے تو وہ منشائے خداوندی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دے گا۔ اس اجتماعی نظام سے وابستگی (بلکہ یوں کہئے کہ خود اس کے لاینفک اجزاء اور کارفرما ہونے) کی بنا پر ان کی حیاتِ ارضی، ازابتدا تا انتہا، الاسلام کی جامع تفسیر ہوگی (ولا تموتن الا وانتم مسلمون)۔ اس نظام کے اجزا ہیں

(۱) قرآن۔ یعنی ضابطۂ آئینِ اسلام۔

(۲) مرکز۔ یعنی ضابطۂ خداوندی کی قوتِ نافذہ۔ اور

(۳) جماعت۔ افرادِ معاشرہ جن سے یہ نظام تشکیل ہوگا۔

اور اس کی عملی تشکیل کے اصول و مبانی ہیں۔

(ا) افرادِ معاشرہ میں کامل ائتلاف۔ یعنی یکدلی و یک نگہی و یک قدمی۔ اور

(ب) مرکز کی اطاعت۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ نظام، جماعتِ مومنین کی پوری زندگی پر چھایا ہوتا ہے اور دن اور رات میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اس کے احاطے سے باہر ہوں۔ یہ ان کی "حیاتِ انسانی" کیلئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو ان کی "حیاتِ طبیعی" کے لئے ہوا کی حیثیت ہے۔ ہوا پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں جو اس کی ضرورت اور اہمیت کا معترف نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ ڈاکٹروں کو اکثر و بیشتر یہ فقرہ دہرانا پڑتا ہے کہ صحت اور زندگی کے لئے کھلی اور تازہ ہوا کی اشد ضرورت ہے۔ دہرانا اس لئے پڑتا ہے کہ کسی شے کی یاددہانی (ذکر) سے اس کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آئینِ خداوندی نے بھی اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ اس نظام کی بار بار یاددہانی کرائی جائے، تاکہ اس کے اصول و مبانی اُجاگر ہوتے رہیں اور اس کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اسی یاددہانی کا نام "صلوٰۃ" کا فریضۂ موقت ہے۔ یعنی خاص اوقات کا اجتماعِ صلوٰۃ۔

دین کے نظام (اسلامی معاشرہ) کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فوز و فلاح کی زندگی، انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ اجتماعِ صلوٰۃ کی ابتدا اسی اصول سے ہوتی ہے، ایک دعوت پر یکجا ہوئے افراد کا ایک مقام پر جمع ہو جانا۔

دین کے نظام میں اگلا قدم اطاعتِ مرکز ہے۔ اجتماعِ صلوٰۃ میں اس کا مظاہرہ عملی شکل میں سامنے آجاتا ہے جب یہ اجتماع اپنے میں سے سب سے بہتر فرد کو بہ حیثیت امام چن لیتا ہے (اور بہتر ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہے) یہی امام اس اجتماع کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس ایک کی آواز پر سب کو اٹھنا ہوتا ہے اور اسی کی آواز پر جھکنا۔ اور یہ جھکنا اور اٹھنا ایک ساتھ ہوتا ہے جو شہادت دیتا ہے اس حقیقت کبریٰ کی کہ اس جماعت کے افراد میں کامل ہم آہنگیٔ فکر و عمل ہے۔ اس سے معاشرے کی ناہمواریاں مٹتی ہیں۔ ("امام" اس تاگے کو کہتے ہیں جس سے معمار یہ دیکھا کرتا ہے کہ دیوار بالکل سیدھی اٹھ رہی ہے۔ اس کی اینٹیں آگے پیچھے تو نہیں ہیں)۔

دین کے نظام کا اگلا اصول یہ ہے کہ یہ نظام عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مرکزِ محسوس بیت اللہ ہے۔ لہٰذا اجتماعِ صلوٰۃ میں اس حقیقت کی یاددہانی کے لئے جماعت کا رخ قبلے کی طرف رکھا جاتا ہے۔ یعنی ساری دنیا کے مسلمانوں کا مطمحِ نگاہ اور نصب العین ایک ہوگا۔

اسلامی معاشرے کا قیام، قانونِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے اور اجتماعِ صلوٰۃ سے مقصود اسی اصل الاصول کی یاددہانی ہے۔ اس لئے قرآن کے بغیر صلوٰۃ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی غائت ہی افرادِ معاشرہ کی توجہات کو قرآن پر مرکوز کرنا ہے۔ اسی مقصد کی یاددہانی کیلئے یہ اجتماعات رکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں قرآن دہرایا جاتا ہے تاکہ اس ایمان (نصب العین حیات) کی تجدید ہوتی رہے کہ ہم نے ہر غیر قرآنی نظام کی مخالفت میں سینہ سپر ہو کر قائم رہنا ہے اور جھکنا ہے تو صرف اسی کے فیصلوں کے سامنے جھکنا ہے۔

قرآن کا یہ مقام اس لئے ہے کہ یہ کسی انسانی ذہن کا وضع کردہ قانون نہیں بلکہ اس خدا کا متعین فرمودہ ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کا سرچشمہ اور ربوبیت کا کفیل ہے۔ جس کی ذات، زندگی کے تمام متنوع (اور بظاہر متضاد) گوشوں میں کامل توازن (حسن) کی مظہرِ اتم ہے (انہی گوشوں کو صفاتِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے) لہٰذا وہی معاشرہ بہترین توازن (حسنِ کامل) کا آئینہ دار ہو سکتا ہے جس میں اس کی صفات منعکس ہوں۔ اجتماعِ صلوٰۃ میں قرآن کو سامنے لانے سے یہ تمام تصورات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایک ایک کر کے ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

انسان کی ساخت اس قسم کی واقعہ ہوئی ہے کہ اس کے جسم کی حرکات اس کے جذبات کا ساتھ دیتی ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کے جذبات کا اظہار، زبان سے کہیں زیادہ، اس کی جسمانی حرکات سے ہوتا ہے۔ کسی مقرر کو دیکھئے۔ اس کی زبان، تقریر کے الفاظ ادا کرتی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ شدید انداز میں اس کے اعضا حرکت کرتے ہیں۔ اگر اس پر پابندی لگا دی جائے کہ دورانِ تقریر میں اسے بالکل غیر متحرک رہنا ہوگا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے لئے تقریر ناممکن ہو جائے گی۔ اور اگر اسے تقریر پر مجبور کر دیا جائے تو وہ جذبات سے بالکل خالی ہوگی۔ تقریر تو ایک طرف، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک شخص تنہا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں، سر، مختلف قسم کے حرکات میں مصروف ہیں۔ انہی حرکات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کے خیالات میں مستغرق ہے۔

اجتماعِ صلوٰۃ میں جن تصورات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان کے ابھر کر سامنے آنے سے، افرادِ جماعت کے سینوں میں جذبات کا تلاطم ناگزیر ہے۔ قیام و رکوع و سجود، انہی جذبات کے متحرک آئینے ہیں۔ لیکن اس میں اظہارِ جذبات بھی اسی نظم و ضبط کے ساتھ ہے جو اس معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے۔

بیقراری ہے، کس قرار کے ساتھ جبر ہے دل پہ، اختیار کے ساتھ

قیام و سجود کا امتزاج، اسی جبر و اختیار کے امتزاج کا حسین مرقع ہے اور یہی ایک عبدِ مومن کی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔ لیکن یہ جبر وہ ہے جس سے اختیارات کی وسعتیں اور بھی حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ یہ سجدہ وہ ہے جس سے قیام کی قوتیں اور بھی جلال انگیز ہو جاتی ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اجتماعِ صلوٰۃ درحقیقت پورے کے پورے نظامِ دین کی سمٹی ہوئی شکل (Miniature Form) ہے۔ اس ذرا سے نگینے میں پورا "تاج محل" جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سپاہی کی ساری زندگی (شب و روز کی ہر آن) سپاہیانہ نظام کے مطابق گذرتی ہے۔ لیکن شب و روز میں کچھ اوقات (پریڈ وغیرہ کے) ایسے بھی رکھے جاتے ہیں جن میں پورے فوجی نظام کی مشق (یا، یاددہانی) تھوڑے سے وقت میں، اس کی سمٹی ہوئی شکل میں کرا دی جاتی ہے تاکہ اس سے اس کے نظام کے پورے خط و خال اس کے ذہن میں مستحضر رہیں اور یہ حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ اس کی زندگی کا

مقصود اور اس کی تگ و تاز کا نصب العین کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پریڈ یا تجدیدی مشق (Refresher Course) کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہیں اور ان کی پابندی نہایت ضروری ہے لیکن یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہوتیں۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ کسی مقام پر نہ تو اپنی مملکت رہے اور نہ ہی اس کا کوئی فوجی نظام لیکن کچھ لوگ گذشتہ دور کی یاد میں پریڈ کے وقت کسی جگہ اکٹھے ہو کر یا اپنے اپنے ہاں الگ الگ بندوق کی جگہ لکڑی ہاتھ میں لیکر پریڈ کی نقل کرتے رہیں تو اس سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے۔ (یاد رکھئے کہ میں نے یہ چیز محض سمجھانے کے لئے بطور مثال لکھی ہے۔ یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ میں نے صلوٰۃ کو پریڈ قرار دیدیا ہے)۔

ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں دین کا نظام اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ قائم تھا۔ اس نظام کے اندر صلوٰۃ کا اجتماعِ مؤقت اپنی پوری اہمیت رکھتا تھا۔ یہ اجتماع اس نظام کی سمٹی ہوئی شکل اور اس کے عناصر و عوامل اور اغراض و مقاصد کی یاددہانی کراتا اور سینوں میں عزائم کو بیدار اور دلوں میں ولولے پیدا کرنے کا موجب بنتا۔ جب، کچھ عرصے کے بعد یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو صلوٰۃ ایک رسم بن کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ اس صلوٰۃ کی رسم کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا تھا (نہ ہی آسکتا تھا۔ اس لئے کہ جس نظام کی یاددہانی کے لئے یہ اجتماع ہوتا تھا، وہ نظام ہی گم ہو چکا تھا)۔ اب اگر ملت کا مقدر یاوری کرتا تو نگاہ کا رُخ اس طرف پلٹتا کہ اس نظام کو دوبارہ قائم کرنا چاہئے جس کی یاددہانی کے لئے یہ اجتماع مقرر کیا گیا تھا لیکن ہمارے جرائم کی سزا کی مدت چونکہ ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے توجہ اس طرف نہ گئی بلکہ سمجھ یہ لیا گیا کہ یہی رسم مقصود بالذات ہے۔ اگر اس کا کوئی نتیجہ اس وقت سامنے نہیں آتا تو نہ سہی۔ اس کا ثواب ضرور ہوتا ہے جو قیامت میں ہمارے سامنے آجائیگا۔

مذہب (دین نہیں بلکہ مذہب) کی بنیاد، یوجا پاٹ کے تصور پر ہے۔ اس میں سمجھا یہ جاتا ہے کہ ایشور (خدا) ہماری بھگتی (پرستش) سے خوش ہوتا ہے (جس طرح بادشاہ، کورنش بجالانے سے خوش ہوجاتا تھا) اور اگر اس کی پرستش نہ کی جائے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے۔ اُدھر مسلمانوں سے دین کا نظام رخصت ہوا اِدھر ان کے ذہنوں پر عجمی تصورات نے اثر اندازی کی۔ نتیجہ یہ کہ انھوں نے بھی اپنے دین کو مذہب سمجھ لیا۔ اور اس لئے صلوٰۃ کے عظیم القدر نظام کو پرستش فرض کر لیا گیا۔ نظام کے گم ہوجانے سے صلوٰۃ کا اصلی مقصود نگاہوں سے پہلے ہی اوجھل ہو چکا تھا۔ اسے پرستش قرار دے لینے سے یہ ذہنی الجھن بھی رفع ہوگئی کہ اس رسم سے مقصود کیا تھا۔ عجم میں مجوسیوں (پارسیوں) کے ہاں پرستش کی رسم کو نماز کہا جاتا تھا (یہ لفظ ہی انہی کے ہاں کا ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے) لہٰذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی۔ اور قرآن کی اصطلاح "اقیموا الصلوٰۃ" کا ترجمہ ہو گیا، نماز پڑھو۔ جب گاڑی نے اس طرح پٹڑی بدل لی تو اس کے بعد کا ہر چکر اسے منزل سے دور لے جاتا گیا۔ چنانچہ اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے ذہن، نماز پڑھنے کے علاوہ کسی اور طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ اور نماز پڑھنے سے مراد ہے خدا کی پرستش کرنا ـــــ یہ ہے فرق صلوٰۃ اور نماز میں۔

صلوٰۃ ــــ نظامِ دین کی سمٹی ہوئی شکل جس سے مقصود اس نظامِ خداوندی کے نمایاں خط وخال اور اغراض وغایات کو بار بار ذہن میں نمایاں اور دل میں منقوش کرنا تھا تاکہ جماعتِ مومنین اپنی زندگی کے مقصود ومطلوب کو ہر وقت سامنے رکھے اور اس کے حصول وقیام میں ہر ممکن کوشش کرے۔

اس کے برعکس، نماز ــــ خدا کی پرستش کی رسم جو مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور پارسیوں کے ہاں اس کا نام تک بھی یہی ہے۔

نبی اکرمؐ نے قرآن کے ارشاد کے مطابق، نظامِ صلوٰۃ کو قائم فرمایا تھا جس میں موقت اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

ہم اس رسمِ پرستش کو پورا کرتے ہیں جس کا تصور عجمی اثرات کے ماتحت وجود میں آیا تھا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

میں نے یہاں "پرستش" کے متعلق زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا، اس لئے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے، عبادت کے عنوان سے میرا ایک مبسوط مقالہ (طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ میں اس مقالہ میں بتا چکا ہوں کہ قرآن کی رُو سے عبادت سے مفہوم، قوانینِ خداوندی کی اتباع ہے نہ کہ پرستش۔ اصل سوال جس کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہم خدا کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمارا ذہن، زمان ومکان (Time and Space) کی حدود میں گھرا ہوا ہے، اس لئے ہم ان حدود سے ماوراء کسی شے کا علم نہیں رکھ سکتے۔ یہ چیز ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا مطالبہ خدا کی معرفت کا نہیں۔ ہمارے لئے اس کا عرفان ناممکنات سے ہے۔ اسے اپنے متعلق انسانوں کو جو کچھ بتانا تھا وہ وحی کے ذریعے بتا دیا۔ اب ہمارا اور خدا کا تعلق صرف قرآن کے ذریعے ہے۔ قرآن کو درمیان سے ہٹا دیجئے، خدا کے متعلق اپنے اپنے ذہنی تصور سے زیادہ کوئی علم ہمارے پاس باقی نہیں رہے گا اور جہاں تک ذہنی تصور کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ یہ نہ علم ہے نہ معرفت۔ یہ یکسر انفرادی شے ہے۔ یعنی ہر ذہن میں خدا کا تصور الگ الگ ہوگا۔ لہٰذا اس قسم کا خدا، ذہنِ انسانی کا تراشیدہ خدا ہی ہوگا۔ یہ مذہب کی سطح اور اس کا پیدا کردہ خدا ہے۔ مذہب نے ان انفرادی تصورات کی جگہ ایک قسم کا تصور پیدا کرنے کے لئے، بت تراش دیئے یا انسانوں کو اوتار بنا دیا تاکہ اس طرح مختلف افراد کے ذہن میں "خدا کا تصور" ایک جیسا پیدا ہو جائے۔ ان محسوس پیکروں سے مختلف افراد کے ذہن میں "خدا کی تصویر" تو ایک جیسی کھنچ گئی لیکن اس سے خود انسان جس پست ترین سطح پر جا گرا وہ ظاہر ہے۔ قرآن نے مذہب کے اس سارے کھیل کو باطل قرار دیدیا۔ اس نے خدا کی معرفت (پہچان) کا مطالبہ ہی نہیں کیا۔ اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ ہم ذہنوں میں خدا کا تصور پیدا کرتے پھریں۔ اس نے وحی نازل کی اور کہا کہ یہ ہے خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ضابطۂ قوانین جس کے مطابق تمہارے معاشرے کی تشکیل ہونی چاہئے۔ اس قسم کے معاشرے کا نتیجہ انسانیت کی ربوبیتِ عامہ ہوگی جس سے انسان زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے گا اور اس طرح وہ زمان ومکان کی موجودہ حدود (اقطار السموٰت والارض) سے آگے جا سکے گا۔ یہ قوانین تمام کے تمام احکام کی

شکل میں نہیں ہیں (قرآن میں احکام بہت کم ہیں) بلکہ ان اصولوں کی صورت میں ہیں جن کی بنیادوں پر اس معاشرے کی عمارت استوار ہوگی۔ جب ہمارے معاشرے کی تشکل ان اصولوں کے مطابق ہوگی تو اس سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں گے ان سے ان اصولوں کی حقانیت اور صداقت محسوس پیکروں میں متشکل ہو جائیگی اور اس طرح وحی پر ہمارا ایمان، علیٰ وجہ البصیرت یقین میں بدل جائے گا۔ اس معاشرے کے مختلف گوشے (Facets) ان صفات کے مظہر ہوں گے جنھیں قرآن نے اسماء الحسنیٰ (صفاتِ خداوندی) کے نام سے متعارف کردیا ہے۔ اس طرح یہ معاشرہ، اپنے محدود دائرے کے اندر صفاتِ خداوندی کا عکاس بن جائے گا۔ اس وقت جب انسان دیکھے گا کہ ان صفات کا عکس، اس محدودیت کے باوجود، اس کی حیات اجتماعیہ میں ایسا عظیم القدر انقلاب پیدا کر دیتا ہے تو اس تصور سے کہ ان صفات کی لامحدودیت کیا ہوگی، اس کے قلب میں ان صفات کے سرچشمۂ سرمدی کے متعلق عظمت و رفعت کا تحیر انگیز احساس بیدار ہو جائیگا جو اس کے قلب کو والہانہ جذبات سے متموج کر دے گا۔ چونکہ صلوٰۃ کا اجتماع اسی انقلاب آفریں نظام کی سمٹی ہوئی شکل کا نام ہے اس لئے یہ اجتماع ان جذبات و احساسات کا مشہود پیکر بن جائے گا۔ اس اعتبار سے بھی دیکھئے تو یہ اجتماع جہاں ایک طرف، رسم پرستش سے یکسر جداگانہ چیز ہوگا دوسری طرف یہ عام انسانی اجتماعات سے بھی مختلف ہوگا۔ یہ وہ خصوصیت کبریٰ ہے جو اجتماعِ صلوٰۃ کو منفرد بنا دیتی ہے۔ لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ خصوصیت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب یہ اجتماع نظامِ خداوندی کے درخشندہ نتائج سے پیدا شدہ احساسات کا آئینہ بردار ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہی صلوٰۃ رسم پرستش بن جاتی ہے جسے نماز کہا جاتا ہے۔

اب آپ کے سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔ آپ کو اس سوال کے پوچھنے میں کسی معذرت طلبی کی ضرورت نہ تھی۔ اگر آپ میرے پاس ہوتے تو از خود دیکھ لیتے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ یہاں سے دور ہیں اس لئے آپ کو لکھ کر پوچھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ فرق دونوں میں کچھ نہیں۔

میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اگر کہیں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو تو ان کے ساتھ شامل ہو جانے میں بھی توقف نہیں کرتا۔ یہاں آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ ایک طرف میں موجودہ نماز کو ایک بے روح رسم پرستش قرار دیتا ہوں اور دوسری طرف اس رسم کا خود بھی پابند ہوں؟ میں اس کے متعلق اس سے پیشتر بھی لکھ چکا ہوں اور اسے آج پھر دہراتا ہوں کہ میرا مسلک کیا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہے، میں اس کی روشنی میں مروجہ اسلام کے ایک ایک عنصر پر غور کرتا ہوں اور جس چیز کو بھی قرآن کے منشاء کے مطابق نہیں پاتا اس پر بلا خوف ملامت تنقید کرتا ہوں۔ مقصد میرا صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے مروجہ مذہب کو قرآن کی روشنی میں پرکھنا سیکھیں اور اپنی زندگی کو پھر سے اس کے بتائے ہوئے نظام کے تابع لے آئیں۔ یہ عناصر جن پر میں قرآن کی تنقیدی روشنی ڈالتا ہوں، دو قسم کے اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو قرآن کی تعلیم سے کھلے طور پر ٹکراتے

اور ملت کی بربادی کا باعث ہوں۔ ان سے میں خود بھی محترز رہتا ہوں اور ان سب کو جو میرے ہم فکر ہوں، محترز رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ دوسرے وہ ہیں جن کے اصول تو قرآن میں موجود ہیں لیکن یا تو ان کی جزئیات بے روح بن چکی ہیں اور یا ان میں وقت کے تقاضے کے ماتحت ردوبدل کی ضرورت ہے۔ ان میں روح تو صرف اس وقت پیدا ہوگی جب قرآن کا نظام پھر سے متشکل ہوگا۔ اسی لئے میری تمام سعی وکاوش ملت کی توجہات کو اس اہم نقطہ کی طرف مبذول کرانے میں صرف ہوتی ہے کہ جب تک قرآن کا نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا ان کا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ باقی رہا جزئیات میں ردوبدل کا معاملہ۔ سو اس کے متعلق میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ کسی فرد کو ایسا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ چیز صرف مرکز نظامِ قرآن کر سکتا ہے۔ جب تک وہ مرکز قائم نہیں ہوتا جس قسم کی جزئیات پر ملت کا ربند چلی آرہی ہے، انہی کو برقرار رکھنا چاہئے۔ ان میں انفرادی تغیر وتبدل سے نئے فرقے پیدا ہوتے ہیں۔ اور فرقہ بندی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ کو یہ کہکر بھی فریب نہیں دیتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ان نتائج کا حامل ہے۔ (یا حامل ہوسکتا ہے) جنھیں قرآن مرتب کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیزیں، بے روح اور بے نتیجہ ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک، دین کے اجزاء ہونے کے بجائے مسلمانوں کا قومی شعار سا بن گئی ہیں۔ چونکہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں اور اپنے آپ کو نہ ان سے الگ سمجھتا ہوں نہ برتر۔ اس لئے میں ان سے الگ ہٹ کر کوئی نیا "مذہب" ایجاد نہیں کرنا چاہتا۔ میں اسی درماندہ کارواں کا ہم سفر ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی پکارتا جا رہا ہوں کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہی وہ راہ تھی (یعنی اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے تابع لے آنا) جس کی طرف نبی اکرمؐ نے دعوت دی اس لئے اس راہ کی طرف دعوت دینا سنت رسول اللہؐ کے عین مطابق ہے۔ ہٰذا میں قرآن کا متبع اور قرآن کی طرف دعوت دینے میں سنت رسولؐ اللہ کا پابند ہوں۔ میں اسی مسلک پر جینا اور اسی پر مرنا چاہتا ہوں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

۲۔ انسانی ارتقاء

نظریۂ ارتقاء سے متعلق میرا مضمون (مطبوعہ طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۵۱ء) پڑھنے کے بعد، ایک صاحب نے لکھا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ انسان، سلسلۂ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے۔ ارتقاء کا قانون یہ ہے کہ ایک علت (Cause) سے ایک معلول (Effect) پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلۂ علت ومعلول مسلسل آگے چلا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی ارتقاء (بقول آپ کے) مادہ سے ہوئی ہے اس لئے اس سے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہوسکتا ہے۔

اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہی ہونا چاہئے۔ کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے یہی معنی ہیں؟ یعنی جس خطِ

اس وقت تک ارتقار ہوتا چلا آیا ہے، اسی پر آگے ارتقار ہو۔

جواب آپ نے غالباً قانونِ ارتقائے طبعی کا پورا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اس قانون کا اصول یہی نہیں کہ ایک علت سے اس قسم کا معلول پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ قانون، نظریہ ارتقا کے ابتدائی دور کی پیداوار ہے۔ بعد میں سائنس کی مزید تحقیقات نے یہ بتایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علت (Cause) اپنے سلسلہ کی کتنی ہی کڑیاں پھاند کر کسی ایسے معلول (EFFECT) تک جا پہنچتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ نتیجہ بالکل انوکھا اور یکسر غیر متوقع ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا نام فجائی ارتقار (EMERGENT EVOLUTION) رکھا گیا ہے۔ نباتات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے بیج سے الگ الگ قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں اصطلاح میں (SPORTS) کہتے ہیں۔ یہ واقعہ بڑا نادر الوقوع ہوتا ہے اس لئے ارباب علم و تحقیق اس قسم کے (SPORTS) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انسانوں میں ایک فطین یا نابغہ (GENIUS) کی پیدائش اسی قسم کے (SPORTS) میں شمار کی گئی ہے۔ چنانچہ اس باب میں (HOGBEN) لکھتا ہے:

> تیس سال کے گہرے تجربے نے اس امر کے لئے بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آبار و اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو (Mutants یا Sports) کہتے ہیں۔
>
> (The Nature of Living Matter)

اس قسم کے ارتقار سے جو چیز وجود میں آتی ہے وہ اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سائنس کی تحقیقات نے ایسی اشیار کی تخلیق اور وجود کا تو پتہ لگا لیا ہے لیکن اس کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکی کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ چنانچہ پروفیسر (Taylor) اس باب میں لکھتا ہے:

> ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے، ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نشو و نما کے بعد یہ شے ایک ایسی خصوصیت کی حامل بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی موجود نہ ہو جن سے یہ شے مرکب تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
>
> (Evolution in the light of Modern Knowledge)

ہمارے زمانے میں اس فجائی ارتقار (Emergent Evolution) کا سب سے بڑا امام لائیڈ مارگن ہے۔ وہ اپنی کتاب میں (جو اسی نام پر ہے) لکھتا ہے:

> اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم (Emergent) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ نئے روابط کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کے متعلق وائی گونٹ سیموئیل کہتا ہے کہ

علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنھیں صرف دستِ قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔

فجائی ارتقاء کا نظریہ، عصرِ حاضر کے اہم انکشافات میں سے ہے اور اس کے متعلق شرح و بسط سے لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن ان مختصر سے اشارات سے اتنی بات تو واضح ہو گئی ہو گی کہ قانونِ ارتقاء صرف وہی نہیں جو آپ کے ذہن میں ہے۔ اس میں "فجائی ارتقاء" بھی شامل ہے جس کی رو سے علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے غیر متوقع عناصر کا ظہور پذیر ہو جاتے ہیں جن کے تخلیق کے متعلق سائنس کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیسے ظہور میں آ گئے۔ یہ عناصر سلسلۂ علت و معلول کی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں انسانی سلسلۂ تخلیق کو دیکھئے۔ پیچھے سے سلسلہ طبیعی ارتقاء چلا آ رہا ہے۔ بدا خلق الانسان من طین (انسانی تخلیق کی ابتدا جامد مادہ سے ہوئی) ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین (پھر مختلف ارتقائی منازل کے بعد، یہ اس درجے میں پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعہ حمل ہوتی ہے)۔ یہاں تک عام ارتقائی قانون کی کڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ اس کے بعد، یکایک ایک اور منزل سامنے آ جاتی ہے جو گذشتہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ یعنی ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ پھر اس میں اعتدال پیدا کیا اور اس میں خدائی قوت کا عنصر پھونک دیا)۔ یہ بطریقِ فجائی ارتقاء ہوا۔ اب یہ "تو" (Thou[1]) کہہ کر پکارنے کے قابل ہو گیا کیونکہ اس میں انسانی خصوصیات کے حامل ذرائع علم و تصور (Knowledge and Imagination) پیدا ہو گئے۔ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ۔ (اور تمہارے لئے سماعت و بصارت اور قلب بنایا)۔ یہ "نفخ من روحہ" (خدائی قوت کا شمہ) وہ نیا عنصر یا نیا رابطہ ہے جو سابقہ عناصر کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید اور ترا الاضافہ ہے۔ یہی انسانیت کا امتیازِ خصوصی ہے۔ اسی سے انسان صاحبِ اختیار و ارادہ بنا ہے اور اسی سے اس قابل کہ یہ مجرد زمان و مکان (Abstract time and space) کا تصور کر سکے۔ اس کے بعد اس کی ارتقاء کا خط (Line) وہ نئی پٹڑی ہو گی جسے "نفخ من روحہ" نے متعین کیا ہے۔ یعنی انسان کی موجودہ سطح، دو حصوں کا مرکب ہے۔ ایک خالص طبیعی ارتقاء کا نتیجہ جسے اس کا طبیعی جسم کہنا چاہئے۔ اس کی نشوونما اسی قانون کے مطابق ہو گی جو حیوانی زندگی کو محیط ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو "نفخ روح" (خدائی قوت کی تنفیخ) سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جسے انسان کی مضمر صلاحیتیں کہا جاتا ہے۔ حصہ اول (یعنی جسم) درحقیقت ان صلاحیتوں کا مرکب یا ذریعۂ شہود (پیکر) ہے۔ اسلئے اصلِ انسانیت یہی صلاحیتیں ہیں (اس کی مزید تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے کہ ان خصوصیات کا اہم نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے اور جسم اس اختیار و ارادہ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ) اب اس کی ارتقاء ان صلاحیتوں کے ارتقاء کا نام ہو گا۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:

انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہو گی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے درجے پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے

---

[1] (Thou) کا تخاطب کن انسانی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس کیلئے (Buber) کی کتاب (I and thou) دیکھئے۔

اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے۔ پھر اسکی جبلّی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور سسٹم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا۔

صرف ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء نہیں بلکہ ان کے ساتھ، سیرت کا وہ ارتقاء بھی جو اس پر اس حقیقت کو منکشف کر دے کہ زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے اسلئے ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کے ارتقاء کا راز، تمام افراد انسانیہ کی صلاحیتوں کی برومندی میں مضمر ہے۔ (اسی کا نام نظامِ ربوبیتِ عامہ ہے جس کی طرف میں شروع سے دعوت دیتا چلا آرہا ہوں اور جو قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہے)۔ اس قسم کے جامع ارتقاء کو (کسی اور موزوں اصطلاح کے نہ ہونے کی وجہ سے) "ارتقائے انسانیت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اس کیلئے "تزکیۂ نفس"[1] کی اصطلاح استعمال کی ہے لیکن چونکہ تصوراتِ عجم کے صدقے، اس اصطلاح کا عام مفہوم یکسر غیر قرآنی ہو چکا ہے، اسلئے اس اصطلاح کو اسوقت تک استعمال نہیں کرنا چاہئے جب تک یہ پھر قرآنی مفہوم کی آئینہ دار نہ بن جائے۔ بہرحال، اب انسانی ارتقاء اس جدید خط پر ہوگا اور چونکہ قرآن کی رو سے، زندگی صرف یہی طبیعی زندگی نہیں، اس لئے اس ارتقاء کی منازل، موت کے بعد بھی طے ہوتی رہیں گی۔

آپ نے "صراطِ مستقیم" سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، قرآن سے پہلے، ذہنِ انسانی، زندگی کی دَوری حرکت کا قائل تھا جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی (Dynamic) تصور پیش کر کے یہ بتایا کہ حیات کسی چکر (Cycle) میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے کی (Progressive) ہے۔ "صراطِ مستقیم" سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا۔ پھر، چونکہ "مستقیم" میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے اسلئے اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی، مختلف قوتوں میں توازن رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کسی نچلے نقطے سے اوپر کے نقطے کی طرف جائے۔ لترکبن طبقاً عن طبق (۸۴/۱۹) "تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ"۔ اس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ "صراطِ مستقیم" تمہارے اس نشوونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے جو "ذی معارج" (۷۰/۳) ہے۔ یعنی "سیڑھیوں والا خط"۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے، اوپر کی طرف لیجانے کا ذریعہ بھی، اور گھسیٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے (Jump کرتے ہوئے) اوپر

---

[1] Realisation, Growth and development of NAFS (Self)

چڑھنے کا ذریعہ۔ یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموٰت والارض (۵۵/۳۳) یعنی موجودہ زمان و مکان کی محدودیت سے آگے نکل سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ ارتقا اس نظام ربوبیت کے بغیر ناممکن ہے جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام میں انسانی معاشرہ انہی خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے، جن خطوط پر خارجی کائنات، خدائی قوانین کے سامنے طوعاً و کرہاً، سجدہ ریز، اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلی جا رہی ہے۔ یعنی خارجی کائنات، طوعاً و کرہاً، مشیت کے پروگرام کو پورا کر رہی ہے۔ لیکن انسان، اپنی دنیا میں، اپنے اختیار و ارادہ سے، اس پروگرام کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک عظیم القدر پروگرام کی تکمیل میں ایک دوسرے کے رفیق۔ بقول علامہ اقبالؒ

> اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و نہج میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے، بشرطیکہ انسان اس باب میں پہل کرے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم۔ لیکن اگر وہ اس باب میں پہل نہیں کرتا، اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا، اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا، تو اس کی روح پتھر کی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تشکیل جدید)

لپزگ یونیورسٹی کا پروفیسر ہنس ڈریش (Hans Driesh) اس مقام کے متعلق کہتا ہے کہ وہاں پہنچکر "ہم اپنے آپ کو خدا کے سپاہی کہہ سکتے ہیں"۔ قرآن اس جماعت کو "حزب اللہ" کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ "حزب اللہ" وہ معاشرہ ہے جو قرآنی نظامِ ربوبیت کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔

جس چیز کا نام ہم نے "نفخِ روحِ خداوندی" کا نتیجہ رکھا ہے، ذرا غور کیجئے کہ اس کی خصوصیتِ کبریٰ کیا ہے؟ قرآن نے اس فجائی ارتقاء کے بعد فرمایا ہے کہ پھر انسان کو سماعت و بصارت اور فؤاد مل گئے۔ سماعت و بصارت وغیرہ حواس، خارجی دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ معلومات انسان کی داخلی دنیا میں ایک مقام پر پہنچتی ہیں جہاں سے مختلف امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ "فیصلہ کرنے" کا نام اختیار و ارادہ ہے۔ حیوانات کی نقل و حرکت ان کے جبلی تقاضوں (INSTINCT) کی رو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے سامنے بیک وقت ایک سے زیادہ ممکنات (Possibilities) آتے ہیں۔ ان ممکنات میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب کو فیصلہ کہتے ہیں اور یہ فیصلہ اختیار و ارادہ کی رو سے ہوتا ہے۔ لہٰذا "فؤاد" کا کام انسانی اختیار و ارادہ کا استعمال ہے۔ یہی بنیادی خصوصیت ہے جو انسان کو حاصل ہے۔

انسانی جسم کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کر کے "اندر" پہنچاتا رہے اور پھر "اندر" سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی تعمیل کرے۔ اس کے برعکس، حیوانی سطح کی زندگی میں تمام تقاضے انسانی جسم کے ہوتے ہیں (جنہیں خواہشات کہا جاتا ہے) اور "اندر" کے فیصلے کو وہاں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک حیوانی سطح کی زندگی جس میں جسم کے تقاضے جبلی طور پر (Instinctively) پورے ہوتے رہیں اور انسانی اختیار و ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ دوسرے انسانی سطح کی زندگی جس میں اصل شے انسانی فیصلہ ہو

اور جسم اس فیصلہ کرنے والی قوت کیلئے آلہ اور ذریعہ کا کام دے۔ اس اعتبار سے انسانی معاشرے کی تین قسمیں ہو جائیں گی۔

(۱) جس میں نہ جسم کے تقاضے پورے ہوں نہ قوتِ فیصلہ کے استعمال کے مواقع۔ یہ زندگی انسانی سطح تو ایک طرف، حیوانی سطح سے بھی گئی گذری ہوتی ہے۔

(۲) جس میں انسانی جسم کے تقاضے تو پورے ہوتے رہیں لیکن نفس انسانی (اختیار و ارادہ) کی تربیت و پرورش کا سامان نہ ہو۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی۔ اور

(۳) جس میں جسم انسانی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی اختیارات کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ انسانی زندگی کی سطح ہوگی۔ قرآن یہی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس میں ہر وہ عمل جو انسانی اختیار کو وسعت و تقویت بخشتا ہے، عملِ خیر کہلاتا ہے (خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے)۔ لیکن چونکہ اختیار و ارادہ، تخریبی مقاصد کیلئے بھی صرف ہو سکتا ہے اور تعمیری کیلئے بھی، اس لئے وہ اختیار و ارادہ کے استعمال کے لئے ایک روشنی، ایک میزان، ایک معیار بھی دیتا ہے تاکہ ہر اختیار، تعمیری نتائج کا حامل ہو، تخریبی کا نہ ہو۔ یہ میزان ضابطۂ آئینِ خداوندی (قرآن) ہے۔

لہٰذا جس معاشرے میں

(ا) انسانی جسم کے تقاضے بطریقِ احسن پورے ہوتے رہیں۔

(ب) انسانی اختیارات کے حدود وسیع سے وسیع ہوتے رہیں۔ اور

(ج) انسانی اختیارات کا استعمال وحی کی روشنی میں ہو

وہ قرآنی معاشرہ یا مسلمان کی زندگی ہے۔ اس معاشرے میں انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھے گی۔ اس میں تمام خارجی دنیا کی تسخیر ہوگی (وسخر لکم ما فی السموات والارض جمیعاً) اور چونکہ انسانی جسم بھی خارجی (طبیعی) دنیا سے متعلق ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی تسخیر ہوگی۔ یعنی جسم کا کام انسانی قوتِ فیصلہ (نفس) کے لئے معلومات فراہم کرنا اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا۔ اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائیگی اسی قدر انسانی زندگی ابدیت (Immortality) سے ہمکنار ہوتی جائیگی۔ جب جسمانی نظام طبعی قانون کے ماتحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے لئے دوسرے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائیگا۔

اس قوت کی پختگی اور وسعت صرف اس نظام میں ہو سکتی ہے جسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے اختیار و ارادہ سے دوسروں کی پرورش و تربیت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی جسم کے تقاضوں کے پورا کرنے کا نظام از خود موجود ہو۔ اس نظام میں یہی ہوتا ہے۔ ہر فرد کی تمام بنیادی ضروریات (جسم کے تقاضوں) کے پورا کرنے کا ذمہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے اور افراد اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی محنتوں کے ماحصل کو پورے کے پورے معاشرے کی تعمیر و تربیت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ

معاشرہ (حزب اللہ) جس کی کھیتی پکتی ہے (ھم المفلحون)، جس کے درخت برگ و بار لاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ جو سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزلوں میں پہنچنے کے اہل ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ تو انسان، خالص طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے (بلکہ اس کی "انسانیت" طبعی ارتقاء کے سلسلۂ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبیعی ہوگا۔ طبیعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے۔ اس میں جو ہر انسانیت غیر طبیعی ہے۔ جسم انسانی، اس جوہر انسانیت کے فیصلوں کیلئے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا آلہ یا واسطہ ہے۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ اس غیر طبیعی جوہر انسانیت کا ہوگا۔ جسے ہم جان (یا کہتے ہیں وہ درحقیقت جوہر انسانیت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہر انسانیت (انسانی اختیار و ارادہ) کی نشوونما ارتقاء قرآنی نظام ربوبیت سے ہوتی ہے۔ زندہ وہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآنی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخر کئے جاتی ہیں، نہ کہ وہ جس کے جسم کی طبیعی مشینری چل رہی ہے۔ جو اس طرح زندہ ہے وہ موت سے نہیں مر سکتا۔ اسی کا نام سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔

سوچئے کہ ہم میں آج کتنے زندہ ہیں!

۳۔ آدم | ایک اور صاحب لکھتے ہیں:

آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، انسان سلسلۂ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا اس شکل میں آیا ہے۔ اس صورت میں آدم سے کیا مراد ہوگی کیونکہ ابھی تک تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ ہم سب بابا آدم اور اماں حوا کی اولاد ہیں، یعنی انسان کے ایک جوڑے سے ساری نسل آگے چلی ہے۔

جواب | آدم کے متعلق میں تفصیل سے معارف القرآن کی دوسری جلد میں لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے معلوم ہوگا کہ قرآن کے بیان فرمودہ قصۂ آدم میں آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں بلکہ اس سے مراد نوع انسانی کا نمائندہ (Representative of Man Kind) ہے۔ اور وہ قصہ کسی ایک شخص کی سرگزشت نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ماجریات و کیفیات کی تمثیلی داستان ہے۔ (تفصیل محولہ بالا کتاب میں ملے گی)۔

نقد و نظر

حیات اکبر الہ آبادی

بزم اکبر کراچی نے سید عشرت حسین مرحوم کی تسوید اور ملا واحدی صاحب دہلوی کی ترتیب و تہذیب اور خواجہ حسن نظامی صاحب و عبدالماجد صاحب دریابادی کے حواشی کے ساتھ اکبر آبادی کے سوانح حیات شائع کئے ہیں۔ کتاب کا حسن صوری، بزم کی طرف سے اس سے پیشتر شائع شدہ "اکبریات" کا ہم رنگ۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت ۳ روپے ۸ آنے۔ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اکبر الہ آبادی کی سوانح عمری ہے جو ہمارے گذشتہ دور کے اپنے مخصوص رنگ کے نہایت کامیاب شاعر تھے۔ متنِ کتاب سے بھی اسی کی شہادت ملتی ہے۔ لیکن "پیش کش" سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ سوانح حیات کسی اور بزرگ کے ہیں جو اپنے زمانے کے قطب یا ابدال بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ کر تھے۔ وہ پیش کش یہ ہے۔

دولت خداداد پاکستان کی بزم اکبر نے عارف کامل مردِ حق آگاہ حضرت اکبر الہ آبادی کی یہ سرگزشتِ حیات جسمانی، روحانی جس ذات پاک کی امداد سے تیار کرائی ہے اُسی کے عرش اعظم کے سامنے یہ علمی نذر پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ ان اوراق میں اس انسان کے کمالات علمی و روحانی کا تذکرہ ہے، جو الہامات یزدانی کے فیضان سے بدرجہ اتم فیضیاب تھا اور جسکو خالق ارض و سما نے[1] پس ماندہ ملک ہند کی بیداری و خداشناسی و خودشناسی کی تبلیغ کے لئے مامور فرمایا تھا۔

یہ پیش کش اس نیت سے ہے کہ وہ سب انسان جو بھارت و پاکستان میں رہتے ہیں خود کو پہچانیں اور حسب مرضی خداوندی فرائض زندگی کو ادا کریں۔

نذر گزاران

صدر و ممبران بزم اکبر

ہم ہیچمدان چونکہ حضرت اکبر کے ان مقامات قدسیہ سے واقف نہیں اس لئے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا دخل در معقولات ہوگا۔ البتہ ہم صدر و ممبرانِ بزم اکبر کی خدمت میں اتنا عرض کرنے کی جرات ضرور کریں گے کہ وہ اپنی عقیدت کا اظہار اور جن الفاظ میں چاہتے کرتے لیکن اکبر کو مامور من اللہ[1] تو نہ بناتے۔ یہ بات بہت دور تک جا پہنچتی ہے۔ غور کیجئے! شخصیت پرستی انسان کو کہاں تک لے جاتی ہے؟

کہتے ہیں کہ روما کے بڑے گرجے میں حضرت مریم کی تصویر کے نیچے عقیدت مند اپنی ارادت کی شمعیں جلاتے ہیں۔ اس تصویر پر ان شمعوں کے دھوئیں کی تہیں اس طرح چڑھ گئی ہیں کہ اصل تصویر جو آرٹ کا ایک نادر نمونہ تھی سیاہی میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔

یہی حالت مشرق میں سوانح نگاروں کے ہاتھوں اُن کے مشاہیر کی ہوئی ہے۔ اے کاش! انہیں یہ معلوم ہو سکتا کہ ایک داستان

---

[1] پیش کش کے الفاظ ہیں "انہیں خالق ارض و سما نے ...... کی تبلیغ کے لئے مامور فرمایا تھا"۔

کی عظمت اس کے انسان ہونے سے ہے، نہ کہ مافوق الفطرت اعجوبۂ روزگار ہونے میں۔ سیرت نگاری (Biography) کی بہترین مثال دیکھنی ہو تو قرآن میں سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کو دیکھئے کوئی چیستاں نہیں۔ مافوق البشریت کا شائبہ تک نہیں۔ ایک چلتے پھرتے انسان کے وقائع حیات ہیں۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تو معراجِ انسانیت۔ یہ ہے سیرت نگاری کا کمال۔

۲۔ فتنۂ مودودیت

۹۲ صفحات کا ایک پمفلٹ جسے "جناب مولانا ابوالمظفر محمد نذرالدین صاحب نذر" نے "تحریک مودودی کی کتابوں سے اخذ کر کے اور علمائے عظام کے خیالات کی روشنی میں مرتب کیا ہے"۔ قیمت بارہ آنے۔

کچھ دنوں سے مولوی صاحبان کی طرف سے بھی اسلامی جماعت کی تحریک کی مخالفت شروع ہوئی ہے اور ہندوستان اور پاکستان کے مفتی حضرات نے ان کے خلاف فتوے بھی شائع کئے ہیں۔ زیرِ نظر پمفلٹ اسی قسم کی کوشش کا مظہر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کی اس قسم کی کوششوں سے یہ تحریک اور زور پکڑ جائے گی۔

پچاس ساٹھ برس پہلے قادیان سے اسی قسم کی تحریک اٹھی جب تک مولوی صاحبان اس کی تائید کرتے رہے یا کم از کم خاموش رہے وہ تحریک بے جان سی رہی۔ جب انھوں نے اس کی مخالفت شروع کی تو وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھی اور بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ علامہ اقبال رح نے اس کی رگِ جان پر ہاتھ ڈالا اور اسے قبرستان تک پہونچایا۔ یہی تحریک اب نیا جنم لیکر مودودی صاحب کے پیکر میں نمودار ہوئی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرائیگی۔ ہم اس نتیجہ تک محض قیاس سے نہیں پہنچے۔ اس کی وجوہات ہیں۔

تحریک اسلامی جماعت کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اگر آپ اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہے ہیں تو یہ حقیقت آپ پر منکشف ہو چکی ہوگی کہ یہ تحریک کسطرح قادیانی تحریک کے نقوشِ قدم پر چلتی آ رہی ہے۔ قیامِ دعوت سے پہلے مرزا صاحب نے براہین احمدیہ لکھی۔ اس زمانے میں عیسائی اور آریہ مناظروں کی طرف سے اسلام پر اکثر حملے ہوا کرتے تھے۔ جن سے مسلمان زچ پڑ جاتے تھے۔ مرزا صاحب نے مسلمانوں کی اس ضرورت کو بھانپ لیا اور براہین احمدیہ سے ان کی تائید اور ہمدردی حاصل کر لی اس طرح مقبولیت حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا حتیٰ کہ مقامِ نبوت تک پہنچ گئے۔ ان کے دعاوی مجددیت، مہدویت، مسیحیت، نبوت کا مدار احادیث پر تھا۔ مولوی صاحبان خود احادیث کو دین مانتے تھے۔

احادیث کی کیفیت بقول مرزا صاحب یہ ہے کہ یہ "مولوی کا پٹارہ ہے جس میں سے جو چاہو نکل سکتا ہے"۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ مولوی صاحبان مرزا صاحب کی رد میں ایک حدیث لاتے تھے اور مرزا صاحب اپنی تائید میں دو حدیثیں پیش کر دیتے تھے۔ مولوی صاحبان کی کوششیں انفرادی تھیں۔ مرزا صاحب نے ایک منظم جماعت قائم کر لی تھی اس لئے ان کا پروپیگنڈا بھی منظم طریقہ پر ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مولوی صاحبان "خاتَم بالفتح یا بالکسرہ" کی بحثوں میں الجھے رہے۔ اور عوام دن بدن اس نئی تحریک کے دام کرزور میں پھنستے چلے گئے۔ عوام کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی تھا جو اس دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار ہوا۔ اس زمانے میں صورت یوں تھی کہ مسلمان گھرانوں کا عام ماحول مذہبی تھا (یعنی وہی پرانی مذہبی روش کا ماحول) دوسری طرف سرسید کے تحریک سے مغربی تعلیم بھی ملک میں پھیل رہی تھی

اس تعلیم سے نوجوان کچھ "ماڈرن" بن جاتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وراثتی اور ابتدائی ماحول کے اثرات کی وجہ سے نوجوانوں کا یہ طبقہ دل کی گہرائیوں میں مُلّا تھا لیکن مدرسے اور کالج کی تعلیم کی وجہ سے خارجی طور پر ماڈرن اس قسم کے یہ نوجوان طبعاً ایک ایسے "مذہب" کی تلاش میں تھے جو ان کے ان دونوں تقاضوں کو پورا کر دے۔ تحریک قادیانیت کے علمبرداروں نے نوجوانوں کے ان رجحانات کو بھی بھانپا اور اپنی تحریک کو ماڈرن لباس پہنا دیا۔ اس طرح یہ طبقہ ان کے جال میں پھنس گیا اور انہی کی دیکھا دیکھی عوام بھی کھنچے چلے آئے۔ عوام کے لئے دلیل ہی یہ ہوتی تھی کہ جب ایسا لکھا پڑھا سمجھدار طبقہ اس تحریک میں شامل ہو رہا ہے تو اس تحریک میں کچھ تو ضرور ہے!

لیکن اس تحریک کی مخالفت کرنے والوں میں سے کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی کہ یہ تحریک تھی ہی سیاسی اور معاشی مذہب کا نقاب اسے مصلحتاً اُڑھایا گیا تھا۔ باقی رہے ان کے دعاوی۔ سو ان کا جواب قرآن میں تھا، روایات میں نہیں تھا۔ علامہ اقبال نے ان کے مذہبی نقاب کو جھٹک کر الگ کر دیا اور اس کے پیچھے چھپی ہوئی استعمار فرنگیت کی بنوت محکوم کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا۔ باقی رہے ان کے دلائل۔ سو وہ محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں "قرآن کی رُو سے لباسِ شطرنج کے گھوڑے" کی طرح "اڑھائی گھر" میں بند ہو جاتے ہیں

غور کیجئے کہ مودودی صاحب کس طرح اسی مدفون تحریک قادیانیت کے بروز بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں مسلمانوں کی جنگ "نیشنلسٹ علماء" کے خلاف تھی۔ مودودی صاحب نے نیشنلزم کے خلاف بہت کچھ لکھا اور اس طرح (براہین احمدیہ کی طرح) مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ فکر معاش میں پنجاب کی "بنوت خیز" سرزمین میں تشریف لے آئے یہاں پہنچ کر انہوں نے پہلے ڈاڑھی بڑھائی پھر آہستہ آہستہ پیدائشی مسلمانوں کے نقائص و عیوب گنوانے شروع کئے۔ ازاں بعد دوسری "قیادتوں" کی تنقیص و تنکیر شروع ہوئی۔ اور اس حصہ اوّل کے بعد نہایت معصومانہ انداز سے اس دعوت کی ابتدا کر دی کہ

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

"پیدائشی مسلمانوں" سے کہا کہ تمہارا ایمان ناقص ہے۔ آؤ اور میرے ہاتھ پر تجدید ایمان کرو۔ نوجوانوں کا وہ طبقہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اب بھی موجود ہے یعنی وہ نوجوان جو طبعاً مُلّا ہوتے ہیں لیکن مغربی تعلیم کے اثر سے خارجی طور پر ماڈرن بن جاتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنی مُلّا ازم کے لئے بیکر بالکل ماڈرن تجویز کئے اور (اس طرح قادیانیت کے تتبع میں) نوجوانوں کے اس گروہ کے گناہوں میں اپنی تحریک کو جاذب بنا لیا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس تحریک کے مداحوں میں (قادیانی تحریک کی طرح) بیشتر طبقہ اس قسم کے نوجوانوں کا ہے خواہ وہ ابھی کالجوں میں ہوں یا دفتروں میں آ چکے ہوں۔

اس مجددیت کے بعد مودودی صاحب ایک قدم آگے بڑھے اور اپنی "بروزی بنوت" کا صغریٰ کبریٰ یوں قائم کیا۔

(۱) حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اتباع صرف اس کے قانون کی جائز ہے۔ کہئے کون مسلمان ہے جو اس سے انکار کریگا!

(۲) اس قانون کی عملی شکل رسول اللہ نے قائم کر کے بتائی اس لئے قانون کا اتباع سنتِ رسول اللہ کے اتباع سے ہو سکتا ہے

اس کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں

(۳) سنت رسول اللہ احادیث کے اندر ہے۔ احادیث اور قرآن ایک ہی ہیں احادیث "مثلہٗ معہٗ" (قرآن کے ساتھ قرآن جیسی) وحی ہے۔ مذہب پرست طبقہ صدیوں سے اس آواز کو سنتا چلا آرہا تھا اس لئے اس میں بھی کوئی بات قابل اعتراض نہ تھی۔ بلکہ اس سے سنت رسول اللہ کے اتباع کی شدت کا احساس ہو جاتا تھا۔

(۴) احادیث کے مجموعوں میں قوی اور ضعیف، صحیح اور غلط، ہر قسم کی حدیثیں ہیں اس لئے ہمیں سنت رسول اللہ کی اتباع کیلئے صرف انہی احادیث کو لینا چاہیئے جو بالکل صحیح ہوں۔

یہ بات بھی بہت معقول تھی۔ بالخصوص نوجوانوں کے اس طبقے کے نزدیک جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ

(۵) سوال یہ نہیں کہ آج تیرہ سو برس کے بعد کسطرح معلوم ہو کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط۔

جواب ملا کہ اس کے لئے علماء سلف نے جرح و تعدیل کے اصول مقرر کر رکھے ہیں۔ ان کے مطابق احادیث کی جانچ پڑتال بھی ہو چکی ہے۔ وہی اس بات کے پرکھنے کے معیار ہیں۔ ارشاد ہوا کہ نہیں۔ یہ سب غلط ہے۔

(۶) یہ بات کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط، صرف وہ بتا سکتا ہے جو "مزاج شناسِ نبوت" ہو۔ اس لئے کسی اور معیار اور میزان کی ضرورت نہیں۔ اس بات میں اس مزاج شناس کا فیصلہ قول فیصل ہوگا۔ حتکہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس میں رسول اللہ کی کوئی حدیث موجود نہ ہو تو یہ "مزاج شناس نبوت" بتا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ اس وقت ہوتے تو آپ کیا فیصلہ فرماتے آپ نے غور کیا کہ ان سیڑھیوں کی ترتیب کیا بنی؟

(ا) حاکمیت خدا کے لئے ہے۔

(ب) اس حاکمیت کی عملی شکل سنت رسول اللہ کی اتباع میں ہے۔

(ج) سنت رسول اللہ احادیث میں منضبط ہے۔

(د) احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کی سند مودودی صاحب کا فیصلہ ہے۔

حتکہ جس معاملہ میں کوئی حدیث موجود نہ ہو اس میں بھی وہی بتا سکتے ہیں کہ ان حالات میں رسول اللہ کیا فیصلہ فرماتے۔

یعنی ——— خدا کی حاکمیت سمٹ سمٹا کر اس "مزاج شناس نبوت" کے فیصلوں میں محصور ہو گئی۔

سوچئے کہ مرزا صاحب بیچارے کا دعویٰ اس سے کچھ زیادہ بھی تھا؟ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ اتباع رسول سے انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کہ وہی بتا سکتا ہے کہ منشائے رسول کیا تھا۔ اس کا نام ظلی اور بروزی نبوت ہے۔ مودودی صاحب "ظلی اور بروزی" کی جگہ "مزاج شناسی" کہتے ہیں۔ محض اصطلاحات کا فرق ہے۔ بات حرفاً حرفاً وہی ہے۔

مرزا صاحب کے ہاں مخالفین کے اعتراضات کا جواب ہمیشہ الزامی ہوتا تھا۔ اور مولوی صاحبان کے لئے یہ الزامی جوابات

مسکت ہوتے تھے۔ اس لئے کہ جو جرم یہ حضرات مرزا صاحب کے خلاف عائد کرتے، وہ اس قسم کا جرم ان کے اسلاف میں سے کسی نہ کسی کے خلاف ثابت کر دیتے۔ اسلاف پرستی چونکہ مولوی کے مذہب کی اساس و بنیاد ہے اس لئے وہ ایسے جوابات کے بعد کبھی جرأت لب کشائی نہ کر سکتے اب جو مولوی صاحبان نے اسلامی جماعت کی مخالفت شروع کی ہے تو انھوں نے بھی ان کے اعتراضات کے جواب میں وہی ٹیکنک اختیار کی ہے۔ یعنی الزامی جواب۔ مثلاً ایک صاحب ہیں منظور نعمانی۔ رسالہ الفرقان بریلی کے ایڈیٹر۔ یہ پہلے اسلامی جماعت کے "السابقون الاولون" میں سے تھے۔ بعد میں مسلک "اعتزال" اختیار کر کے الگ ہو گئے۔ انہوں نے پچھلے دنوں ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں اسلامی جماعت پر (مشورے کے انداز میں) کچھ اعتراضات کئے ہیں۔ ان کے اعتراضات کا جواب اسلامی جماعت کے حکیم نور الدین (یعنی امین احسن صاحب اصلاحی) کی طرف سے "ترجمان القرآن" کی نومبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ نعمانی صاحب نے منجملہ دیگر ایک اعتراض یہ بھی کیا تھا کہ اسلامی جماعت کے موجودہ مسلک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ دنوں کے بعد یہ ایک مذہبی فرقہ بن جائے گی۔ اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے

> پہلا سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے یا چند مسائل میں کتاب و سنت کی دلیل سے ایک حکم شرعی بیان کرنے اور اس کی اتباع پر چند لوگوں کے جمع ہو جانے سے ایک مذہبی فرقہ بن جاتا ہے تو مولانا کے نزدیک اس "فرقے" کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ وہی تفرق فی الدین ہے۔ جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے یا یہ ان اختلافات میں سے ہے جن کے جواز کی اس دین میں گنجائش پائی جاتی ہے[1]؟ اگر مولانا کے نزدیک یہ تفرق فی الدین ہے تو ان بزرگوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے جنہوں نے دو چار مسلوں میں نہیں ہزہا مسائل میں اپنے اختیار سے احکام شرعیہ مرتب کئے اور ان میں سے ہر ایک کے اتباع پر لاکھوں کروڑوں مسلمان جمع ہو کر الگ الگ گروہ بن گئے کیا یہ سب تفرق فی الدین کے مجرم تھے؟ اور اگر مولانا اس فعل کو جائز اختلافات میں شمار فرماتے ہیں تو براہ کرم وہ ارشاد فرمائیں کہ جو چیزیں اگلوں کے لئے جائز تھی وہ پچھلوں کے لئے کس دلیل سے حرام ہو گئیں؟

آپ نے جواب ملاحظہ فرمایا؟ معترض صاحب خود "نعمانی" (حنفی) ہیں اس لئے انہیں یہ الزامی جواب دیا جاتا ہے کہ اگر اس طرح فرقہ بنانا جائز ہے تو امام ابو حنیفہؒ کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ غور کیجئے کہ اس جواب کے بعد مولانا نعمانی صاحب کیا فرما سکتے ہیں یہی کچھ مرزائی کیا کرتے تھے۔ اور یہی انداز اب اسلامی جماعت والوں کا ہے اس لئے مولوی صاحبان نہ ان سے بازی لے جا سکتے تھے نہ لے جا سکینگے ان کا جواب صرف وہ دے سکے گا۔ جو اللہ کے قانون کو دین مانے اور قرآن کے فیصلوں کے سامنے کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی روک (انداداً من دون اللہ) بن کر نہ کھڑا ہونے دے۔

سب سے آخری چیز یہ کہ تحریک قادیانیت اور مودودی صاحب کی تحریک دونوں کا مسئلہ معاشی ہے۔ مرزا صاحب اپنی تحریک سے پہلے سیالکوٹ میں ایک قلیل مشاہرہ پر ملازم تھے اس کے بعد تحریک شروع ہوئی اور اس کے "ثمرات" میں سے انہوں نے جو کچھ اپنی اولاد کے لئے چھوڑا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

---

[1] دین میں نہیں بلکہ "مذہب" میں کہئے۔ اس لئے کہ دین قرآن کے اندر محصور ہے اور قرآن اختلافات کو بہت بڑا جرم قرار دیتا ہے

یہی حالت علمبرداران تحریک مودودیت کی ہے۔ نعمانی صاحب نے اسلامی جماعت کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ یہ تحریک اشتراکیت سے متاثر ہے اور اس کے جواب میں اصلاحی صاحب نے لکھا ہے۔

اشتراکیت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سارا فلسفہ پیٹ کے محور پر گھومتا ہے۔ کیا فی الواقعہ مولانا کے نزدیک جماعت اسلامی کی تمام سرگرمیاں کا محور بھی پیٹ ہی ہے اور خدا، رسولؐ اور اسلام کا نام محض عوام فریبی کے لئے استعمال کر لیا ہے؟

ساری جماعت کے متعلق تو معلوم نہیں۔ لیکن بانیانِ تحریک کے متعلق تو واقعات کی شہادت ایسی ہے جس سے سوچنے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کا سارا فلسفہ بے شک پیٹ کے محور پر گھومتا ہے اور خدا، رسولؐ اور اسلام کا نام وہ محض عوام فریبی کے لئے استعمال کرتے ہیں ہم نے چونکہ واقعات کو شاہد قرار دیا ہے اس لئے مجبوراً بات نام لیکر کرنی پڑیگی اس کے سوا چارہ نہیں۔

اس تحریک کے بانی مودودی صاحب ہیں۔ تحریک سے پیشتر یہ صاحب حیدرآباد میں تھے۔ ہم انہی سے پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں کہ پنجاب آنے سے پہلے حیدرآباد میں ان کی مالی حالت کیا تھی؟ اس کا جواب اُن سے لیجئے یا ان لوگوں سے پوچھئے جو ان کی اس زمانے کی حالت سے واقف ہیں اس حالت کو سامنے رکھئے اور آج لاہور میں ان کی کوٹھی پر جاکر دیکھئے کہ ان کی زندگی کے کیا ٹھاٹھ ہیں! اس کے بعد ان سے پوچھئے کہ اس دوران میں انہوں نے کیا کاروبار کیا ہے جس سے ان کی حالت وہاں سے یہاں تک پہنچی ہے!

ان کے بعد خود اصلاحی صاحب کو لیجئے جنہوں نے سوال کیا ہے کہ کیا اسلامی جماعت کا سارا فلسفہ پیٹ کے محور پر گھومتا ہے! اس تحریک سے پہلے اصلاحی صاحب سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) کے گاؤں کے مدرسہ میں ملازم تھے (ہم یہ نہیں کہتے کہ مدرسہ کی ملازمت کرنی قابل ملامت شے ہے۔ مقصد صرف واقعہ بیان کرنے سے ہے) علامہ فراہیؒ کی وفات کے بعد اس مدرسہ کی مالی حالت خراب ہوگئی۔ رسالہ اصلاح بھی بند ہوگیا۔ اس کے بعد ہم اصلاحی صاحب کو اسلامی جماعت میں دیکھتے ہیں۔ کیا اصلاحی صاحب اتنا بتانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے کہ اس وقت ان کی آمدنی کسقدر تھی۔ اور آج کی آمد و خرچ کی کیا کیفیت ہے کہدیا جائے گا کہ ہمارا لٹریچر بکتا ہے اس سے آمدنی ہوتی ہے۔ (مرزا صاحب کے متعلق بھی یہی کچھ کہا جاتا تھا کہ ان کی کتابیں بکتی ہیں) لیکن سوال یہ ہے کہ تحریک سے پہلے بھی تو ان صاحبان کے ہاتھوں میں یہی قلم تھا اور اسی قلم سے نکلا ہوا لٹریچر شائع ہوا کرتا تھا۔ اس وقت یہ لٹریچر کیوں نہیں بکتا تھا۔ اور آج کیوں بکتا ہے! کیا یہ جماعت ہی ان حضرات کے لٹریچر بیچنے کا ذریعہ نہیں! ان سے کہیئے کہ اس تحریک سے الگ ہوکر پھر اپنا لٹریچر بیچ کر بتائیں۔ قرآن میں غور کیجئے حضرات انبیاء و کرام کے تذکار جلیلہ میں دو بنیادی چیزیں آپ کو نمایاں طور پر دکھائی دیں گی۔ ایک ان کی دعوت الی اللہ۔ یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ۔ (اے میری قوم! صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی اور حاکم نہیں) اور اس کے ساتھ ہی دوسری چیز اس امر کا اعلان کہ لا اسئلکم علیہ من اجرا (میں تم سے اس دعوت کا کوئی اجر نہیں مانگتا) آپ سوچئے کہ یہ دوسرا نکتہ اللہ کی نگاہ میں اتنا اہم ہے کہ دعوت کے بنیادی اصول (لا الٰہ الا اللہ) کے ساتھ ہی اس کا ذکر دینا ضروری سمجھا گیا۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگر خدا کی طرف دعوت دینے والوں" کا ذریعہ معاش الگ نہ ہو تو پھر سارا فلسفہ پیٹ ہی کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔ مُلّا کی اپنی رسوائی اور قوم کی تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مُلّا کی تعلیم میں کوئی عنصر ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنی روٹی آپ کمانے کا اہل بن سکے۔ ہندوستان میں ان کی روٹی کا سامان ہو رہا تھا لیکن تقسیم کے بعد وہاں کے مسلمانوں کی ابتری کی وجہ سے اس ناکارہ گروہ کے لئے وہاں کی فضا ساز گار نہ رہی تو اس ٹڈی دل نے پاکستان کا رخ کرلیا۔ یہاں جتنی مسجدیں یا مکتب تھے ان کی "اسامیاں" پہلے ہی پُر تھیں۔ نئی مساجد یا مکاتب اتنی تعداد میں کہاں سے بن جاتے کہ اس لشکر کو سمو لیتے! ان میں سے جن حضرات کے دل میں احساسِ غیرت تھا انہوں نے کسی نہ کسی طریق پر محنت و مشقت سے اپنی معاش کا انتظام کیا (اللہ تعالےٰ ان کی محنت میں برکت عطا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے) لیکن باقی طبقہ نے دوسروں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ یہ ایک اہم مسئلہ (Problem) تھا جس کا حل قوم کو سوچنا چاہئے تھا۔ جب قوم نے اس کا حل نہ سوچا تو اس بیکار گروہ نے خود ہی اس کا حل تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مرتکبانہ کرنا! یہ "اللہ اور رسولؐ" کے نعرے اس پریشان کن مسئلہ کی عقدہ کشائی کے ذرائع ہیں۔ یہ چیزیں قوم کے لئے بڑی مصیبت ہیں۔ لیکن جو قوم اپنے بیکار طبقہ کی معاش کا فکر نہیں کرتی اسے اس قسم کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ طبقہ ہر اس آواز کی مخالفت کرے گا جس سے قوم میں بیداری پیدا ہو جانے کا احتمال ہو کیونکہ اس سے ان کی روٹی خطرے میں پڑجاتی ہے۔ قرآن میں دیکھئے۔ ہر اجتماعی جرم کی ابتدا مترفین (دوسروں کی کمائی پر جینے والوں) کی طرف سے ہوئی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظام ربوبیت کی راہ میں سنگ گراں بنکر حائل ہوتے ہیں کیونکہ اس نظام میں جہاں ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری نظام پر ہوتی ہے وہاں دوسری طرف بلاعذر بیکار رہنے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والوں کو جہنم رسید کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کے نام سے لرزتے ہیں اور "سنت رسولؐ کی آڑ میں" اپنے خود ساختہ مذہب کو اپنے لئے سپر بناتے ہیں جس میں علماء کی دوات کی روشنائی کے قطرے کو مردِ مجاہد کے خون کے قطرے سے زیادہ گراں بہا بتایا جاتا ہے یہی وہ احبار و رہبان ہیں جنہوں نے امم سابقہ کو غارت کیا اور یہی خیر امت کی بربادی اور تباہی کا موجب ہے۔

لہٰذا "فتنہ مودودیت" کا استیصال "مولانا نذر صاحب" کے پمفلٹوں سے نہیں ہو سکتا اس کے لئے ضرب کلیمی کی ضرورت ہے اور وہ صرف قرآن کی رو سے ممکن ہے :-

---

معارف القرآن کی قیمت میں رعایت

کی میعاد دسمبر کے بعد ختم ہو جائے گی۔

کیا آپ نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا ؟

سازش، اور بہت بڑی سازش

(علامہ تمنا عمادی)

مذکورہ بالا عنوان سے جو مضمون طلوع اسلام مورخہ ماہ اگست ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے، اس کے پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوا تھا کہ کاش مجھے ہجوم مشاغل سے فرصت ہوتی اور صحت بھی اچھی رہتی تو میں اس مضمون کے متعلق کچھ لکھتا۔ پرسوں میرے عزیز احمد صاحب جعفری پروفیسر قائد اعظم کالج ڈھاکہ آئے تو انھوں نے باصرار کہا کہ میں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ بھی اس موضوع پر کچھ لکھئے اور متعہ کی حقیقت پر روشنی ڈالئے۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ باوجود صحت کی خرابی کے کل دوسرے کاموں کو ایک حد تک پہنچا کر آج طلوع اسلام کے اس مضمون اور نفس متعہ پر قلم اٹھا رہا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وکفی باللہ شھیدا۔

طلوع اسلام میں شائع شدہ مضمون کا اصل موضوع متعہ نہیں ہے بلکہ منافقین و ملاحدۂ عجم کی کوشش تخریب دین، اور اس کیلئے ان کی گہری سازش کا حال بیان کرنا ہے۔ متعہ کا ذکر اس میں مثال کے طور سے پیش کیا گیا ہے۔ مگر میں اس گہری سازش کا حال اپنے متعدد مضامین میں آج سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مسند امام احمد کی تاریخ کے ضمن میں رسالہ البیان میں جبکہ وہ امرتسر سے نکلتا تھا، اس سازش کا ذکر آیا ہے۔ پھر اس سے بھی پہلے ابن جریر طبری صاحب تفسیر و تاریخ کے ترجمے پر بھی میرا ایک مضمون البیان میں چھپا تھا جس پر ایک صاحب سے کچھ نوک جھوک بھی ہو گئی تھی اور جانبین کے مضامین البیان ہی میں کئی ماہ تک چھپتے رہے۔ اس سلسلے میں بھی اس سازش کا ذکر آ گیا ہے۔ جب البیان لاہور سے نکلنا شروع ہوا تو مسئلہ متعہ والی حدیث کی تنقید میں اس سازش پر کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ کتاب تاریخ جمع قرآن جو زیر طبع ہے۔ مگر آج سے تقریباً پندرہ برس قبل کی تصنیف ہے اس میں بھی اس سازش کی کافی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جمع و تدوین احادیث کا کام سب سے پہلے اسی سازش کے ماتحت شروع ہوا۔ طلوع اسلام ہی میں بضمن ترجمۂ ابن شہاب زہری بھی اس سازش کا ذکر آ گیا ہے۔

غرض مجھکو اس وقت نفس سازش پر مزید بحث کرنا نہیں ہے بلکہ اس وقت متعہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ مگر تخریب دین کی سازش جو روایات سازی کے ذریعے اس زمانے میں جاری تھی، تھوڑی بہت روشنی اس کی نوعیت پر بھی ڈالتا جاؤنگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

سب سے پہلی بات تو یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ روایت احادیث کا کام سب سے پہلے ملاحدۂ عجم نے شروع کیا تھا، اور یہی ملاحدۂ عجم، کوفہ، بصرہ اور تقریباً شام و عراق کے اکثر علاقوں میں پھر مصر و حجاز میں بھی کم و بیش پھیلے ہوئے تھے اور عجم میں خراسان و نیشاپور ان کے خاص مراکز میں سے تھے اور ان سبھوں نے خاندان نبویؐ کی حمایت کا ایک شور مچا رکھا تھا اور حضرت علیؓ کے طرفدار بن کر ان کی فضیلت کی حدیثیں بنا بنا کر پہلے سے مشہور کر رہے تھے۔ انہی میں کے بعض ایسے بھی تھے جو مصلحۃً خارجی بن کر حضرت علیؓ

پر سب وشتم بلکہ لعنت تک کیا کرتے تھے، مگر درحقیقت وہ تھے انہی میں سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، صرف تقیہ وکتمان کے ذریعہ خارجی بنے ہوئے تھے اور اپنے کو خارجی مشہور کئے ہوئے تھے۔ جامعین حدیث جن سے حدیثیں لے لے کر جمع کرتے تھے ان میں زیادہ تر یہی لوگ تھے۔

وہ زمانہ بٹوارے سے پہلے کا تھا جب شیعہ وسنی کی فرقہ وارانہ تقسیم وتفریق نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ کوئی فرقہ صرف اپنے ہی فرقے کے راویان احادیث سے حدیثیں لے کر جمع کرتا تھا۔ شیعوں میں سب سے پہلے ابوجعفر کلینی متوفی ۳۲۸ھ نے اصول وفروع کافی لکھی جس میں صرف شیعہ راویانِ حدیث ہی سے حدیثیں لیں۔ اور جن کی روایتیں عموماً حضرت جعفر صادقؒ ہی تک منتہی ہوئی ہیں۔ ان سے آگے بڑھنے کی انھوں نے کوئی خاص ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ شیعہ مذہب کی سب سے پہلی کتاب یہی ہے۔ ابن جریر طبری نے بھی بعض کتابیں خاص شیعہ مذہب والوں کے لئے لکھیں، مگر ان میں اپنے دادا کا مجوسی نام "رستم" ہی بتایا، اور تفسیر وتاریخ میں اپنے دادا کا اسلامی نام "یزید" لکھا۔ بعد والوں کو جس سے دھوکا ہوا کہ محمد بن جریر رستم ابوجعفر الطبری کوئی اور تھا اور محمد بن جریر بن یزید ابوجعفر الطبری کوئی اور ہے۔ پہلا پکا رافضی تھا اور دوسرا معمولی درجہ کا شیعہ تھا۔ جیسا کہ امام ذہبی سمجھے اور ان کی تقلید میں ابن حجر اسمعانی وغیرہما بھی ایسا ہی لکھ گئے۔ حالانکہ دراصل دونوں ایک ہی ہیں۔

غرض شیعوں نے بعض بعض تصنیفیں تیسری صدی کے اواخر بلکہ چوتھی صدی سے اپنے خاص لوگوں سے روایتیں لے لے کر لکھیں۔ مگر اہل سنت نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ چنانچہ آپ اہل سنت کی حدیث کی ہر کتاب میں شیعہ راویان حدیث کی روایت کردہ حدیثیں کثرت سے پائیں گے۔ بلکہ بعض شیعہ راویانِ حدیث کی بڑی اہمیت دیکھیں گے۔ اعمش، ابواسحاق، السبیعی کی روایتوں سے قطع نظر کر لیجئے تو اہل سنت کی حدیثوں کا نصف سے زیادہ ذخیرہ ختم ہو جائے گا اور اگر سُدّی وکلبی کی روایتیں ٹھکرا دیجئے جن دونوں کے وضّاع وکذّاب ہونے پر محدثین کا اجماع ہے، تو تفسیری روایتوں کا دو ثلث غائب ہو جائے گا۔ اس لئے اہل سنت کی کتابوں میں متعہ یا "وطی فی الدبر" اور اس قسم کی بے حیائی کی حدیثیں جتنی ہیں وہ اہل سنت کی حدیثیں نہیں ہیں بلکہ شیعوں کا حصہ رسدی ہے جنھیں اہل سنت جامعین نے اپنی کتابوں میں لکھ لیا تھا۔ چنانچہ متعہ کی تمام حدیثوں کو یکجا کر کے دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ حدیثیں کوفے کی سب سے بڑی ٹکسال میں یا بصرے کی ٹکسال میں گھڑی گئی ہیں۔ اور ان کے راوی عموماً شیعہ ہی آپ کو ملیں گے۔ بلکہ زیادہ ایسے ہی ملیں گے جن کی شیعیت کا ائمہ رجال نے اعتراف کیا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ملیں گے جن کا تشیع تو ائمہ رجال پر کھلا نہیں مگر ائمہ رجال نے ان پر دوسری جرحیں ضرور کی ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو کم سے کم صحاح کی جتنی حدیثیں متعہ کے متعلق ہیں انشاء اللہ ان کی تنقید کر کے دکھا دوں گا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ پھر یہ مضمون ایک رسالے کی صورت میں مستقل طور سے چھپوانے کے قابل ہو جائے گا، کسی پرچے میں اس کی اشاعت مناسب نہ ہوگی۔

طریق کار روایتیں گھڑنے والے بڑے چالاک اور نفسیات کے ماہر ہوتے تھے۔ وہ کسی موضوع پر کوئی حدیث بنا کر اس کی روایت واشاعت ہی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی تو نفس مضمون ہی میں کچھ اختلاف پیدا کر کے مختلف طرح

مختلف راویوں کے ذریعہ اس مضمون کو پھیلاتے تھے اور پھر نفس مضمون کی صحت وعدم صحت پر بحث کی جگہ اس کے مختلف عنوانوں پر بحثیں شروع کر دیتے تھے تاکہ نفس مضمون کی صحت بہرحال متفق علیہ ہو جائے۔ بعض مضامین کے متعلق بقائے حکم یا نسخ حکم کا اختلاف پیدا کر کے اسی پر بحثیں شروع کر دیں تاکہ نفس حکم متفق علیہ ٹھہر جائے۔

متعہ متعہ کے متعلق بھی دو قسم کی حدیثیں بنائی گئیں ایک میں کسی خاص وقت تک اس کی اجازت اور اس کے بعد اس کے منسوخ ہو کا ذکر ہے دوسری قسم کی حدیثوں میں تنسیخ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ بقائے حکم کی تصریح بھی بعض روایتوں میں موجود ہے۔ اس کی بھی روایت ہے کہ فلاں فلاں صحابہ اس کے حکم کو منسوخ سمجھتے تھے اور فلاں فلاں اس کے حکم کو قیامت تک کیلئے باقی رہنا صحیح سمجھتے تھے۔

اس اختلاف کے پیدا کر دینے سے اس مفسد جماعت نے یہ فائدہ اٹھایا کہ شیعوں نے تو متعہ کے قیامت تک کے لئے حلال وجائز والی روایتوں کی سند پکڑ لی اور سنیوں نے منسوخ والی حدیثوں کو صحیح مان کر متعہ کے حکم کو منسوخ قرار دیا۔ مگر سنیوں کے یہ مان لینے سے کہ متعہ کی اجازت وقتی طور سے خیبر کے دن یا اوطاس کے دن دی گئی تھی اور پھر منسوخ کر دی گئی، متعہ کی شناعت اور اس کے فحش ومنکر ہونے کا جو اثر ذہنوں پر پڑ سکتا تھا وہ باقی نہ رہا۔ کوئی سنی جو ان حدیثوں کو صحیح تسلیم کرتا ہے جن میں متعہ کی اجازت اور پھر نسخ کا ذکر ہے۔ متعہ کو بے حیائی کا کام بالکل شنیع وفحش نہیں کہہ سکتا اسلئے کہ اگر یہ بالکل زنا ہوتا اور بے حیائی کا کام ہوتا اور فحش ومنکر ہوتا تو رسول اللہ صلعم وقتی ہی طور سے سہی مگر اس کی اجازت نہ دیتے تو جو چیز وقتی طور سے جائز ہو سکتی ہے وہ ہمیشہ بھی جائز ہو سکتی ہے۔ غایت سے غایت اس میں یہ شرط لگا دی جائے گی کہ جب اسی قسم کے مواقع پیش آجائیں تو اس وقت جائز سمجھا جائے گا۔

غزووں میں مدت قیام عہد نبوی میں کوئی ایسا غزوہ نہیں ہوا جس میں صحابہ کو سال دو سال تو کیا پانچ چھ مہینے تک بھی گھروں سے باہر رہنا پڑا ہو۔ اور مہینے ڈیڑھ مہینے کی مدت ایسی نہیں ہو سکتی جتنے دنوں تک کوئی جوان مرد ضبط نفس نہ کر سکے۔ بالفرض اگر کسی خاص شخص کو اس قسم کی بے صبری پیدا بھی ہوتی تو اس فعل شنیع کی جو بالکل زنا ہی ہے اجازت تو کبھی نہیں دی جا سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ خیبر و اوطاس وغیرہ کسی موقعہ پر بھی صحابہ کو کبھی گھروں سے اتنے دنوں تک علیحدہ رہنے کی نوبت نہیں آئی کہ وہ اتنے

بے صبر ہو جائیں کہ خصی ہونے کی اجازت رسول اللہ صلعم سے مانگی۔ یہ واقعہ ہی سرے سے جھوٹا اور من گھڑت ہے۔

خصی ہونے کی درخواست

علاوہ بریں صحابہؓ یہ ضرور سمجھتے ہوں گے کہ اگر ہم خصی ہو گئے تو پھر گھر جانے کے بعد اپنی بیویوں کے کام کے بھی نہ رہیں گے اور زندگی بھر کے لئے بیکار ہو جائیں گے۔ تو پھر ایک وقتی بے صبری دور کرنے کے لئے وہ اس کا ایسا طریقہ اختیار کرنے کا خیال کس طرح پیدا کر سکتے تھے جس کی وجہ سے وہ زندگی بھر کے لئے بیکار ہو جاتے۔ ان روایتوں کی صحت پر یقین کرنے والے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے نفسیات مطہرہ سے، اور جہاد فی سبیل اللہ کی سرشارانہ کیفیت سے بالکل بے خبر ہیں۔ میدان جہاد، جہاں ہر مجاہد جام شہادت کا ہر دم منتظر رہتا ہے اسی پر اور شہوانی خواہشوں کا اس قدر غلبہ کہ وہ بالکل بے خبر ہو جائے؟ اس سے ظاہر ہے کہ نہ ان حدیثوں کے بنانے والے اس عالم سے واقف تھے نہ ان پر یقین کرنے والے اس کیفیت سے آشنا!

مختصر یہ ہے کہ متعہ کے وقتی یا دائمی حکم اور اس حکم کے نسخ یا اجراء وابقاء کے متعلق جتنی روایتیں ہیں بلا استثناء سب کی سب شیعوں کی من گھڑت ہیں اور اہل سنت کی کتابوں میں شیعہ راویوں کا حصہ رسدی ہیں، جن کو ان لوگوں نے سنی جامعین احادیث سے ان کی کتابوں میں لکھوایا۔ اور بعض یا زیادہ حدیثیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن کو ان جامعین احادیث کے شیعہ تلامذہ نے ان کی کتابوں میں ان کو غافل پا کر ان کی زندگی ہی میں یا ان کے بعد داخل کر دیا ایسی کتابیں جن میں یہ جماعت اپنی خود ساختہ حدیثیں داخل کر دیتی تھی اپنی سازش کے ماتحت اس کی جلدی جلدی سینکڑوں خوشخط نقلیں اپنے لوگوں سے کرا کے دور دور ممالک اسلامیہ میں پھیلا دیتی تھی اور اس طرح وہ مغشوش کتابیں مستند سمجھی جاتی تھیں۔ اور جن اصل اور صحیح نسخوں میں وہ حدیثیں نہیں ہوتی تھیں ان کو ناقص قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے بعد والے ان صحیح نسخوں میں بھی دوسری کتابوں سے وہ داخل کردہ حدیثیں اس میں ملا کر اپنے خیال میں اس ناقص کتاب کو بھی مکمل کر لیتے تھے۔ ورنہ کم سے کم اس صحیح کتاب کو ناقص سمجھکر وہ اہمیت نہیں دیتے تھے جو ان مغشوش نسخوں کو کامل سمجھکر دیتے تھے۔

میں نے چاہا تھا کہ متعہ پر ایک رسالہ ہی تنقید احادیث و روایات اختلاف قرارت کے ساتھ لکھ ڈالوں، مگر میرے کتنے رسالے اور کتنی کتابیں مسودے کی صورت میں برسوں سے پڑی ہیں جن کی

اشاعت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ایک اور رسالہ لکھکر اس ذخیرے میں اضافے کا کیا فائدہ؟ جو زیر تحریر کتاب ہے اعجاز القرآن اسی کو مکمل کر دوں، نیا کام شروع کر کے وقت اور دماغ دونوں کو دوسری طرف کیوں لگا دوں۔ ہاں اگر ضرورت پڑی تو انشاء اللہ لکھ ڈالوں گا۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

اعلان

جن احباب کا چندہ ختم ہو چکا ہے،
انھیں علیحدہ طور پر اطلاع دی جا رہی ہے۔
لہذا اگر آپ کا چندہ ختم ہو گیا ہے تو ازرہ کرم
جلد از جلد ادارہ کو مطلع فرمائیے کہ آپ
کا ارادہ خریداری جاری رکھنے کا ہے تو
زر چندہ اس مہینے میں ارسال فرما دیجئے
تاکہ پرچہ آپ کو بدستور پہنچتا رہے۔

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن۔ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے تحت سیرت حضور سرورِ کائناتؐ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین

قیمت: (بیس روپے) ۳۱ دسمبر ۱۹۵۱ء تک کیلئے رعایتی قیمت بارہ روپے محصول ڈاک ۱۲ عہ

تاریخِ رسالت

(معارف القرآن جلد سوم)

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیائے سابقہ کی انقلاب انگیز دعوت توحید

اور

اقوام و مللِ گذشتہ کی عبرت آموز و بصیرت افروز داستانِ عروج و زوال

ضخامت سوا سات سو صفحات۔ (قیمت پندرہ روپے) ۳۱ دسمبر ۱۹۵۱ء تک کیلئے رعایتی قیمت دس روپے محصول ڈاک عہ

ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

کتابیں

حیرت انگیز رعایت صرف تھوڑے عرصہ کیلئے

اقبال اور قرآن	۵—۰—۰	اسلام میں امامت کا تصور	۱—۸—۰
اشتراکیت اور اسلام	۲—۸—۰	تلاشِ حق	۳—۸—۰
اسلام کا نظام عدالت و سیاست	۲—۱۲—۰	تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی	۸—۰—۰
ایم اسلم اور اس کا ادب	۴—۰—۰	سیرتِ اقبال	۶—۳—۰
اسلامی نظریہ اجتماع	۲—۱۲—۰	طارق	۶—۱۲—۰
اسلام کے مشہور امیر البحر	۲—۱۲—۰	دو اسلام	۳—۰—۰
اسلامی خطبات	۲—۸—۰	دو آنسو	۳—۰—۰
الدین القیم	۲—۱۲—۰	مکالمات ابوالکلام	۳—۱۲—۰
اسلامی تہذیب کیا ہے	۳—۰—۰	مقالات اسلم	۴—۰—۰
بلاغ الحق	۲—۰—۰	مسئلہ جہاد کشمیر	۲—۰—۰
بچوں کی نفسیات	۱—۱۲—۰	نالہ پابند نے	۲—۰—۰
پیام مشرق	۵—۰—۰		

محصول ڈاک بذمہ خریدار

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ اور بیشمار کتب موجود ہیں۔ طلب فرمائیے۔

نوٹ: دس روپے سے زیادہ قیمت کی کتابیں خریدنے والے کو بیس فی صدی کمیشن دی جائیگی۔

نصرت کتاب گھر (کتاب لمیٹڈ) رابسن روڈ۔ کراچی